مفلسی میں آٹا گیلا

عبدالمجیب سہالوی

قیمت
تین روپیہ

ناشر
نسیم بک ڈپو - لاٹوش روڈ لکھنؤ
ٹیلیفون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۴۵۵۹

ناشر: عزیز الرحمٰن بار اول ستمبر ۶۸ء پرنٹر سرفراز پریس لکھنؤ

فہرست مضامین

خالی مولیا

کھانے پینے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈاکٹروں کو دکھایا، حکیموں سے مشورہ کیا، ویدوں کی رائے لی۔ سب کہتے ہیں کوئی مرض نہیں۔ سب سے مایوس ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

دیکھیے جناب! وہ زمانہ گیا جب کسی اچھے حکیم سے حال بتائیے تو وہ ڈنڈا لے کر دوڑتا تھا کہ کیا مجھے کوئی عطائی سمجھا ہے جو حال لے کر بیٹھ گیا۔ مگر اب نہ وہ حکیم ہیں اور نہ وہ مریض اور مرض بھی بھانت بھانت کے پیدا ہو گئے ہیں جن کا سراغ بغیر مریض کی نشان دہی کے ناممکن ہے۔

ارے صاحب! آپ نشان دہی کہتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹروں نے تو تھوک اور خون سے لے کر پیشاب پاخانہ تک کھنگال ڈالا، سینہ ٹھوک ٹھوک کر ساری پسلیاں نرم کر دیں، لمبا سانس لیتے لیتے میرا دم نکلنے لگا۔ آپ کیا کہیں ان ڈاکٹروں نے میری کیسی درگت بنائی۔ میں نے آج تک غسل خانے میں بھی بغیر تہبند باندھے غسل نہیں کیا لیکن مرض کی تلاش میں ڈاکٹروں نے میرا انگ انگ ٹٹول ڈالا۔ اور میں اُف کیے بغیر بے حیا بنا کھڑا رہا۔ یہی نہیں۔ اسکریننگ اور ایکسرے کے نام سے نیم برہنہ لٹایا اور کھڑا کیا لیکن اس قسم کی جانچ پڑتال کے بعد بھی اصلی مرض کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ سب نے یہ کہہ کر ٹال دیا آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہو احتیاط کیجیے۔

اب یہ حال ہے کہ کسی پہونچے ہوئے حکیم یا ڈاکٹر کی تلاش میں دن رات سائن بورڈ پڑھتا، سڑکوں اور گلی کوچوں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں کہ کوئی حکیم نابینا جیسا دانا حکیم مل جائے جو بغیر دیکھے مرض کا پتہ لگالے۔ آپ کے سائن بورڈ پر نظر پڑی تو چونک پڑا۔ بے ڈگری کا ڈاکٹر۔ بے دوا کا علاج بے فیس کا مشورہ سائن بورڈ پڑھتے ہی آدھا مرض دور اور دل باغ باغ ہو گیا۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ اندھیری گھٹاٹوپ رات میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی پڑتا ہو کسی نے بھک سے گیس جلادی ہو۔ اور اسی روشنی کے سہارے میں آپ کے مطب میں پہونچ گیا۔

جناب! میں اتفاق سے نابینا تو نہیں لیکن اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ میں بغیر دیکھے آپ کے مرض کا پتہ لگا دوں تو لیجئے میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں اگر آپ کو شبہ ہو تو آپ میری آنکھوں پر رومال باندھ کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ مرض میں بتاؤں گا اور حال آپ بتائیں گے۔ میرا تجربہ ہے اور دنیا کے تمام لال بجھکڑوں کی یہی رائے ہے کہ مرض جسم نہیں حالات پیدا کرتے ہیں اسی لئے میں مریض کے شریر کو ہاتھ لگانا پاپ سمجھتا ہوں، خطا کس کی اور جھنجھوڑا کون جائے۔ کہاں کا انصاف ہے اور کیسا طریقہ علاج۔؟ میں تو صاحب حالات کے کان پکڑ کر مرض کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ اور جب تک مرض برآمد نہیں ہو جاتا ہاتھ کی گرفت ڈھیلی نہیں کرتا۔

گستاخی معاف! دیکھئے آپ آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں ایسی حالت میں اگر آپ نے ٹٹول کر کان پکڑنے کی کوشش کی تو میری عینک جس کی کمانی میری ہڈی پسلی کی طرح ڈھیلی ہو چکی ہیں گر کر ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے یا تو آپ آنکھیں کھول کر احتیاط سے کان پکڑیئے یا مجھے عینک اتارنے کی اجازت دیجئے لیکن عینک اتارنے میں

ایک دقت یہ بھی ہے کہ پھر آپ کو کان چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ کر ٹکانا ہو گا۔ اور اگر آپ آنکھیں کھولے دیتے ہیں تو پھر دوسرے ڈاکٹروں کی طرح دیدہ و دانستہ مجھے اندھا سمجھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھانے کے بجائے میری جیب کاٹنے کی فکر شروع کر دیں گے اور مرض کا پتہ چلانا مشکل ہو جائے گا۔

اجی جناب! آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ میں تو حالات کے کان پکڑنے کو کہہ رہا ہوں اور آپ مارے ڈر کے اپنے کان کھڑے کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حالات بہت پیچیدہ ہیں جن سے آپ کا دماغ ریشہ کا شکار ہو گیا ہے خدا خیر کرے آپ کے حالات معلوم کرنا اور آپ کو مشورہ دینا مشکل ہو گا۔ اس لئے کہ آپ کا شبہ ٹھیے پہ ہاتھ ہی نہ رکھنے دے گا۔ تو آپ حال کیا بتائیں گے اور میں آپ کو مشورہ کیا دوں گا۔ خیر میں ایک مرتبہ پھر یقین دلاتا ہوں کہ میں بے دوا کا علاج کرتا ہوں اور مریض کی جیب کاٹنے کے بجائے حالات کے کان پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں کیوں کہ حالات کے کان پکڑے بغیر جیب کاٹنا بھی تو گناہ بے لذت ہی ہوتا ہے۔ اچھا اب حال بتائیے! آخر آپ کرتے کیا ہیں؟

معاف کیجئے گا۔ میں آپ کے پاس علاج کے لئے آیا ہوں کسی رشتے کے خیال سے نہیں اس لئے اس قسم کے سوال سے کیا نتیجہ؟۔

حضور! میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں مرض اور مریض کا رشتہ حالات ہی کی ڈوری پکڑ کر معلوم کر سکتا ہوں اس لئے اگر آپ حالات نہیں بتا سکتے تو میں آپ کا مرض نہیں بتا سکتا۔

تو سنیئے! میرا پیشہ بذات خود ایک مرض ہے یعنی اخبار نویسی جس میں آدمی دنیا کے غم میں اس طرح گھلا کرتا ہے جس طرح قاضی شہر کے اندیشے میں لیکن آپ جانتے ہیں شہر کا اندیشہ بڑھتا جا رہا ہے اور قاضی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اخبار نویسوں

کا غم بڑھتا جا رہا ہے اور گرانی کی وجہ سے ان کی تنخواہ کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

تو یہ کہئے کہ آپ اخبار میں کام کرتے ہیں۔ اسکے بعد اگر آپ اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت برداشت کر سکتے ہوں تو میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کروں گا کہ آپ شادی کے سلسلے میں کس منزل پر ہیں ؟۔

منزل سے آپ کی کیا مراد۔

مطلب یہ ہے کہ ابھی آپ ضرورت رشتہ کے اشتہارات شائع کرانے اور اپنی ہونے والی گھر والیوں کی تصویریں منگا کر گھر کی زینت بڑھانے کی منزل میں ہیں یا شادی خانہ آبادی کے بعد آپ ——— بڑھتی ہوئی آبادی میں اضافے کے نیک کام میں مستعدی سے مشغول ہیں یا پھر صحافت کی زلف گرہ گیر میں پھنس کر آپ نے شادی کا خیال ہی ترک کر دیا۔ آپ کی شکل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آخری یعنی سب سے زیادہ معقول شکل اختیار نہیں کی اور پہلی منزل آپ عرصہ ہوا پار کر چکے ہیں اور اب آپ اس درمیانی منزل میں ہیں جس کو زندگی کا برزخ کہا جا سکتا ہے۔ اب بتایئے کہ ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں۔!

(ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) تین اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ چھ موجود ہیں اور ایک کی آمد آمد ہے۔

فیس نہ لینے کے باوجود تنخواہ پوچھنے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ؟ بات یہ ہے کہ تنخواہ اور تندرستی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر تنخواہ معلوم کئے آپ کا مرض معلوم کرنا مشکل ہوگا۔ شرمایئے نہیں قومی تعمیر کا کام کرنے والوں کی تنخواہوں میں ثوابِ آخرت بھی شامل ہوتا ہے اس لئے ان کی تنخواہ زیادہ نہیں رکھی جاتی۔

تو پھر سمجھ لیجئے تین سو ساڑھے تین سو کے بیچ میں۔

جی ہاں میں نے عرض کیا تھا کہ آپ زندگی کے برزخ میں ہیں۔ نہ چھوٹوں میں نہ بڑوں میں بلکہ جھٹ بھیتوں میں ہیں۔ یعنی تنخواہ چھوٹی اور مزاج بڑوں کا۔ سب سے ملنے جلنے پر مجبور لیکن گھر میں کسی کو بٹھانے کی گنجائش نہیں مطلب یہ کہ چھوٹا گھر بڑا سمدھیانہ۔

تعلیم کے متعلق پوچھنا ہی بیکار ہے۔ صحافت میں ہونے کی وجہ سے ماشاء اللہ تعلیم یافتہ بھی ہوں گے اور بچوں کو تعلیم دینے کا بھی خبط ہوگا۔

جی ہاں ایک لڑکی یونیورسٹی میں ہے، دو کالج میں، ایک لڑکا ہائی اسکول میں ایک آٹھویں میں باقی پرائمری میں ہیں۔

تو یہ کہیے غم عشق کے سوا آپکو ہر غم کا گھر بیٹھے حاصل ہے۔ اس لیے اگر آپ میرا مشورہ مانیں آپ لگے ہاتھوں غم عشق بھی مول لے لیں لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلے غم عشق مفت مل جاتا تھا لیکن غلہ کی گرانی کا اثر اس پر بھی پڑ گیا ہے۔ اس لئے وہ بھی آجکل کافی گراں پڑتا ہے میرا خیال تھا کہ اگر غم عشق مفت مل جاتا تو شاید علاج بالمثل کی کوئی شکل نکل آتی۔ غم عشق کی گرانی علاج بالمثل میں حائل ہے اس لئے میں علاج بالمثل پر چھوڑ کر آپ کے مرض کی تشخیص کی کوشش کرتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ آپ کو نہ تو خون کے دباؤ میں زیادتی کی شکایت ہے اور نہ کمی کی بلکہ آپ تنخواہ کی کمی اور احساس کی زیادتی میں مبتلا ہیں جس نے آپ کے دل و دماغ کو متاثر کرکے آپ کو مالی خولیا نہیں وہ تو مالدار لوگوں کو ہوتا ہے۔ خیالی مولیا کا شکار بنا دیا ہے۔ اور اس موذی مرض سے آپ کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک آمدنی میں کافی اضافہ اور قیمتوں میں خاطر خواہ کمی نہ ہو۔

مکان کی تلاش

ہمارے ایک دوست ایک دن گھر کی تلاش میں یہ طے کرکے نکلے کہ یا تو مکان ڈھونڈ کر لوٹیں گے یا پھر بے مکان ہونے پر خود لاپتہ ہو جائیں گے لیکن نہ مکان ملا نہ خود لاپتہ ہونے پائے۔ ہوا یہ کہ ہر بند مکان پر للچائی نظریں ڈالنے سے پولیس والے چور کے شبہ میں چوکی پکڑ لے گئے۔

وہ اس کا خیال کئے بغیر کہ شک و شبہات کی اس دنیا میں لوگ اپنے پر نظر رکھنے کے بجائے دوسروں پر نظر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں جس مکان میں تالا دیکھتے لپک پڑتے اور لوگوں سے پوچھ گچھ میں دیر لگانا کے بجائے براہ راست تاک جھانک شروع کر دیتے کبھی کواڑ دبا کر دراز سے مکان کا حلیہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کبھی کھڑکیوں کی سلاخیں پکڑ کر شیشوں سے جھانکتے کبھی مکان کے پیچھے کولیا میں جا کر مکان کی چوحدی کا اندازہ کرتے۔

اسی طرح جب کسی مکان میں قفل پڑا دیکھتے تو اچھل پڑتے اور ان کی للچائی نظریں قفل پر اس طرح پڑتیں کہ دیکھنے والوں کو قطعی یہ شبہ ہوتا کہ یہ مکان کی تلاش میں نہیں بلکہ قفل شکنی کی غرض سے نکلے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بیچارے قفل شکنی تو بڑی بات ہے آجتک کسی کی دل شکنی کی جرأت نہ کر پائے جو قفل شکنی سے کہیں زیادہ آسان ہے اسی لئے اس کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں لیکن رپورٹ ایک بھی درج نہیں

کرائی جاتی کیونکہ یہ جرم دخل اندازی پولیس سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔

اسی کم ہمتی کی وجہ سے ہمارے ان بے گھر دوست کو آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ورنہ ایک عرصہ سے یہ ایک مکان میں مزے سے رہ رہے تھے۔ مکان اچھا اور کرایہ کم تھا۔ مکان دار خوش اخلاق بھی تھا اور ہوشیار بھی وہ مکان خالی کرانا چاہتا تھا لیکن پرانے کرایہ دار سے مقدمہ بازی کے نتائج سے واقف تھا اس لئے اس نے مقدمہ بازی کے بجائے چال بازی کو ترجیح دی۔ وہ اپنے کرایہ دار کی کمزوری جانتا تھا یہ گھر چھوڑ سکتے ہیں لیکن دل نہیں توڑ سکتے۔ وہ ایک دن روتی صورت بنائے آئے اور تھرتھراتے لب اور دھڑکتے دل سے گڑگڑا کر ان سے کہا کہ اب عزت آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ بڑی لڑکی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ آپ سے کیا چوری جو آیا پیٹ کی نذر ہو گیا۔ دان دہیز کے لئے کچھ جمع کیا جاتا تو کیسے؟ لڑکی کا معاملہ ہے شادیاں ٹھہرتی ہی کہاں ہیں قسمت سے لڑکا بھی اچھا ملا ہے لیکن اب تک پیسے کا کوئی انتظام نہیں بہت دوڑ دھوپ کی لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اب آپ ہی کا سہارا ہے اگر آپ نے بھی مایوس کر دیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ میری دنیا اندھیری ہو جائے گی یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

یہ بیچارے مکان دار کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے میں کس لائق ہوں۔ بہرحال میرے لائق جو خدمت ہو میں حاضر ہوں۔ مکان دار نے خوش ہو کر کہا آپ جیسے نیک دل انسان سے توقع بھی ایسی ہی تھی بات یہ ہے کہ اب روپیہ فراہم ہونے کا اور کوئی سہارا نہیں ہے بس صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ مکان فروخت کر دیا جائے خریدار تیار ہے اور منہ مانگے دام دے رہا ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ پورا مکان خالی کر دیا جائے۔ جس حصہ میں ہم لوگ ہیں وہ تو ہم شادی کے چوتھے یا پانچویں دن خالی کر دیں گے۔ اب اگر آپ اتنی عنایت کریں کہ اپنا والا حصہ پہلے

ہیلی کو خالی کر دیں تو سمجھئے کہ آپ نے مکان نہیں خالی کیا بلکہ ہمیں خرید لیا ہم زندگی بھر آپ کا احسان نہ بھولیں گے۔

اس کے بعد یہ رحم دل کرایہ دار حویلی کے بجائے تیس ہی کو اپنے ایک دوست کے یہاں منتقل ہوگئے لیکن مکان خالی ہونے کے بعد نہ تو لڑکی کی شادی ہوئی اور نہ مکان فروخت ہوا بلکہ ان کے حصہ میں ایک نیا کرایہ دار رشتے دار کی حیثیت سے رہ کر جو گمی رقم کرائے کے نام سے نہیں لڑکی کے جہیز کے لیے امداد کے طور پر دے رہا ہے اور بیچارے ہمارے دوست دل شکنی کے گناہ سے بچ کر قفل شکنی کے شبہ میں چوکی کی سیر کے بعد اپنے دوست کے سر پر بدستور سوار ہیں۔

ایک منحوس صبح جب ہم منہ دھو کر بالا ناشتہ کیے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ناشتہ کا انتظار کر رہے تھے کہ ہمارے ایک دور کے عزیز اپنے ایک قریبی عزیز کے انتقال کی خبر لائے جو ہمارے بھی دور کے عزیز ہوتے تھے اور کہنے لگے کہ میں بیمار ہوں گرشتہ کھڑا ہے چلنا ہے تو چلیے چلو اب اس کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے لئے سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ بھوکا پیاسا تعزیت کے لیے روانہ ہو جاؤں ابھی تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ مکان کے مارے ہمارے دوست تعزیت کے لئے نہیں مکان کی تلاش میں جاتے ہوئے راستے میں مل گئے اور رکشا روک کر خیریت پوچھنے کے بجائے مکان کا رونا رونے لگے لیکن میرے پاس بیٹھے میرے عزیز کو روہانسا دیکھ کر انھوں نے اپنا رونا بند کر دیا اور کہا اچھا جائیے مکان کا خیال رکھیئے گا۔ چنانچہ تعزیت کے بعد ہم نے باتوں باتوں میں معلوم کرنا شروع کر دیا کہ مرحوم کے پسماندگان کا اب کیا ارادہ ہے پسماندگان میں ایک بیوہ اور بچی تھی ان کے علاوہ ایک بھائی بھی تھے جو دیہات میں رہتے تھے اسی شکل میں ظاہر ہے کہ بیوہ اور بچی یہاں تنہا کیسے رہ سکتی تھیں لہٰذا مکان چھوڑنا تھا لیکن ہمارے دوست کے لئے کافی تھا اس لئے ہم تعزیت سے فراغت

کے بعد اپنے گھر آنے کے بجائے اپنے دوست کے گھر چلے گئے جہاں مکان کے تلاشی ہمارے دوست عارضی طور پر مقیم تھے اور ان سے کہا کہ اس دنیا کی عجیب ریت ہے ایک کا گھر اجڑتا ہے تو دوسرے کا گھر بستا ہے گھر کا نام سنتے ہی وہ اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے میں اپنے عزیز کے اجڑے ہوئے گھر میں انہیں بسانے کے لئے آیا ہوں میں نے کہا بیٹھئے میں گھر تلاش کرنے نہیں گیا تھا تعزیت کے لئے گیا تھا مگر یہ واقعہ ہے کہ مرحوم کے بال بچے زیادہ دنوں تک اب شہر میں نہیں رہ سکیں گے۔ اس لئے اگر تم چاہو تو ان کے مکان کو الاٹ کرانے کی کوشش کر سکتے ہو۔

الاٹمنٹ کے سلسلے میں انہیں کافی تلخ تجربات ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ الاٹمنٹ کی تو میں کوشش آج ہی سے شروع کر دوں گا لیکن مہربانی کر کے مکان خالی ہونے سے پہلے ہی میرا سامان مکان میں کسی طرح رکھوا دیجئے اس لئے کہ 'خانہ خالی را دیو می گیرد' کی مثل تو آپ نے صرف سنی ہوگی اور مجھے تلاش مکان کے سلسلہ میں اس کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ اس لئے مکان ایک منٹ بھی خالی نہیں رہنا چاہیئے میں نے کہا تو پھر اس کے لئے مرحوم کی بیوہ کے علاوہ مکان کے مالک کو بھی ہموار کرنا ہو گا اس پر وہ بولے اسے ہموار ہی نہیں بلکہ ایک دو ماہ کا پیشگی کرایہ بھی ادا کرنا ہو گا یہ سب کام آپ کریں گے اور الاٹمنٹ کے لیے دوڑ دھوپ میں کر لوں گا۔

اس تقسیم کار کے بعد میں نے گھر آ کر صبح کے ناشتہ کے بجائے رات کا کھانا کھایا جب جان میں جان آئی تو بڑی رازداری سے پوچھا بیگم بتاؤ آج صبح صبح میں نے کس کا منہ دیکھا تھا اس پر وہ منہ بنا کر بولیں آئینے سے پوچھیے مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ کے کمرے میں آئینے اور کتابوں کے علاوہ آدمی کا کہاں گزر ہے اس کے بعد میں نے چپ رہنا ہی مناسب خیال کیا اور لیٹ کر سو رہا۔

صبح سویرے میں آنکھیں بند کئے ہوئے بیگم کے کمرے میں گیا اور کہا۔ اچھا آج

تو میں تمہارا منہ دیکھ رہا ہوں جلدی ناشتہ لاؤ مجھے مکان کی تلاش میں نہیں ایک مکان کو ہموار کرنے جانا ہے گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تاکہ نیت ٹھنڈی نہ ہو اور مالک مکان ہی پر مل جائیں۔ اتفاق کی بات کہ مل بھی گئے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہا۔ "دیکھئے آپ کا وہ مکان جس میں میرے فلاں عزیز رہتے تھے وہ مجھے اپنے ایک دوست کے لئے چاہئے ــــ آپ کو مکان کا کرایہ ڈیوڑھا اور دو ماہ کا پیشگی ملے گا مگر شرط یہ ہے کہ مکان خالی ہونے سے پہلے میرے دوست کا سامان وہاں پہنچ جائے گا۔ اگر آپ کو یہ بات منظور ہے تو خیر ورنہ مکان میرے عزیز کے مرنے کے باوجود آپ کی زندگی میں خالی نہ ہوگا۔ اُن کے نام سے کرایہ میں ادا کروں گا اور ان کے سامان کی حفاظت کے نام سے میرے دوست اس میں قیام کریں گے اس کے بعد وہ راضی ہی نہیں بلکہ مشکور بھی ہوئے۔

میں نے اپنا کام پورا کر کے اپنے دوست کو مطلع کر دیا اور سر کا بار ہلکا کر کے کام میں لگ گیا۔ دن گزرتے گئے اور عدت کے دن پورے ہونے کے بعد میرے عزیز کی بیوہ نے اطلاع دی کہ اب وہ دیہات جا رہی ہیں مکان کا جو انتظام کرنا چاہیں کر دیں۔ میں نے فوراً اپنے دوست کو خوشخبری دی جس سے میرے دوست سے زیادہ میرے دوست کے دوست خوش ہوئے جن کے سر پر وہ اب تک سوار تھے اور انھوں نے بڑی مستعدی سے میرے دوست کا سامان اور ان کی بیوی کو میرے عزیز کے مکان میں پہونچا دیا۔

الاٹمنٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ میرے دوست اپنے کسی شناسا کی سفارش کے ساتھ رنٹ کنٹرول آفس گئے تھے اور بات اگر بالکل پکی نہیں تو ایسی کچی بھی نہیں جس سے انھیں کوئی خطرہ ہو۔ مکان پر قبضہ تو تھا ہی انھیں بھی کوئی زیادہ فکر نہیں ہوئی لیکن وہاں دفتر میں متعلقہ کلرک نے میرے دوست سے زیادہ

اپنے ایک دوست کو مستحق خیال کیا اس لئے اس نے کہہ سن کر میرے دوست کے بجائے اپنے دوست کے نام اس بنا پر مکان الاٹ کرا لیا کہ اس کے دوست کی درخواست آئی تو بعد کو تھی لیکن اندراج پہلے سے تھا۔ اور ایک سہانی صبح جب ہمارے دوست یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ دروازے پر چپراسی کھڑا الاٹمنٹ کا پرچہ دے کر انعام مانگ رہا ہے۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اور یہ جھپٹ کر باہر پہونچے اور خوشی سے پرچہ ہاتھ میں لے لیا اور بغیر کہے انعام کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والے تھے کہ پرچے پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ الاٹمنٹ آرڈر نہیں تخلیہ مکان کا نوٹس ہے جس میں لکھا تھا کہ مکان فلاں ولد فلاں کو الاٹ ہو چکا ہے آپ مکان پر ناجائز طور پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اس لئے مکان معیاد نوٹس ختم ہونے سے پہلے خالی کر دیجئے۔ ورنہ پولیس کے ذریعہ مکان خالی کرا لیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک اداس شام کو خاکی وردی پہنے پولیس والوں نے آکر انھیں گھر بدر کر دیا اور یہ سامان اور بیوی سڑک پر چھوڑ کر خود ہمارے دروازے آکر کھڑے ہو گئے۔

ہم نے ان کی بیوی کو میکے پہونچا دیا اور ان کے لئے اپنے کمرے کی کتابیں ہٹا کر جگہ نکالی۔ جب سے یہ ہمارے سر پر سوار اور مکان کی تلاش میں پھر سرگرداں ہیں ایک دن میں نے ان کے مستقل قیام اور ان کی بیوی کے مسلسل پیام سے عاجز آکر کہا دوست تم نے یہ بنیادی غلطی کی کہ شادی پہلے اور مکان بعد کو تلاش کیا ورنہ اس کا امکان تھا کہ شادی کے ساتھ خانہ آبادی کا بھی انتظام ہو جاتا۔

اس پر وہ برہم ہو کر بولے بھائی میں کیا کروں، آگ لینے کو جاؤں پیمبری مل جائے۔ تمھیں بتاؤ! اس میں میری کیا خطا تھی گھر کی تلاش میں نکلا تھا۔ گھر ملا

نہیں گھر والی مل گئیں خیال تھا کہ نکلنے کی جگہ بھی مل جائے گی لیکن جو بھی جب گئے تو معلوم ہوا کہ شادی میں اتنی عجلت صرف اس لئے کی گئی تھی کہ گھر میں گنجائش کم ہونے کی وجہ سے بیوی کے بھائی کی شادی رکی ہوئی تھی۔

میں نے کہا بھئی مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ آپ کی بیوی بہ یک بینی و دو گوش اپنے باپ کے مکان سے منتقل ہو کر چچا غالب کے اس بے در و دیوار گھر میں منتقل ہو جائیں جو تعمیر کے بعد سے اب تک آپ اور آپ کی بیوی کے انتظار میں خالی پڑا ہے۔

میری یہ بات سن کر میرے دوست میرے وقت سے اٹھ کر جانے ہی والے تھے کہ ایک صاحب نے ایک مراسلہ مکان دار کے مظالم کی جلی سرخی کے ساتھ ہمارے رسالے اشاعت کے لئے رکھ دیا۔ اور پیغام زبانی کے طور پر فرمایا کہ جناب! بے در و دیوار کے مکان میں رہنے کا مزا تو ابھی میں نے چکھا نہیں ہے لیکن بے چھت کے مکان میں رہنے کا حال بتا سکتا ہوں اس پر میرے بولنے سے پہلے ہی میرے دوست اس طرح سے بے تاب ہو کر بول اٹھے جیسے کہ کہنا چاہتے ہوں کہ سے

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے چھت پکار میں چلاؤں ہائے گھر

اس کے بعد بے چھت کرایہ دار نے اپنی بپتا اس طرح برہم ہو کر ہمیں سنانی شروع کر دی جیسے ہماری شہ پر مکان دار انہیں ستا رہا ہے ہم نے ان کا شبہ رفع کرنے کی غرض سے کہا کہ آپ کیا جانیں سے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یہ ہمارے دوست بھی مکان دار کے مارے ہوئے ہیں اور اس پر وہ بولے

بیچارے مرزا غالب کو اس کا تجربہ نہ تھا کہ معشوق کے ناوک سے گھائل ہو کر آشیانے میں مرغ قبلہ نما کی طرح الٹا لیٹنا آسان ہے لیکن بے چھت کے مکان میں مکان دار کے مظالم سے تنگ آ کر تڑپنا مشکل کیونکہ اس کا مطلب اپنے گھر سے لڑھک کر مکان دار کے صحن میں پہونچ جانا ہے۔

میں نے کہا کہ میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ انھوں نے کہا اس کا مطلب آپ اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کو اخبار کے دفتر سے میرے گھر نہ منتقل کر دیا جائے۔ اس پر میرے دوست بے تاب ہو کر بولے انھیں گھر لے جا کے کیا کیجیے گا۔ یہ تو ماشاء اللہ سے خود ہی گھر والے ہیں لیکن میں بے گھر ہوں مجھے پناہ دینا کار ثواب کے علاوہ ایک نوجوان کو خودکشی سے بچانا بھی ہے۔ خودکشی کے نام پر ان صاحب نے ذرا کان کھڑے کیے اور کہا کیا آپ بھی مکان دار کے مارے ہوئے ہیں اس پر میرے دوست نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ میں مکان دار کا مارا بھی ہوں اور مکان کا متلاشی بھی۔

انھوں نے کہا کہ اگر آپ مکان کی تلاش میں ہیں تو میں اپنے تجربہ کی بنا پر ایک نیک مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بھول کر کبھی اوپر کا مکان نہ لیں اور اگر مجبوراً لینا پڑے تو پہلے یہ معلوم کر لیں کہ نیچے کے حصہ میں مکان دار یا اس کا کوئی عزیز تو نہیں رہتا ہے اگر رہتا ہو تو آپ اس مکان میں رہنے کے بجائے بہتر ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا جرم کر کے جیل چلے جائیں وہاں جگہ بھی مل جائے گی اور مکان دار کے مظالم کی زد سے بھی بچے رہیں گے۔

آپ کو معلوم نہیں میں مزے میں ایک پرانے رئیس کے پرانے مکان کے بالائی حصہ میں عرصہ دراز سے رہ رہا تھا مکان بڑا اور کرایہ کم تھا۔ پرانے وضع دار رئیس کو نہ کبھی کرایہ بڑھانے کی فکر ہوئی اور نہ ہم کو زیادہ کرایہ دینے کی توفیق لیکن خاتمہ

زمین داری کے بعد ریاست حکومت کی طرف اور مکانات لالہ مکندی لال کی طرف قرضے میں منتقل ہوگئے اور اب ہمارا پالا ایک وضع دار رئیس کے بجائے ایک نفع باز تاجر سے پڑا جب سے ہماری جان صنیق میں ہے نیچے کا مکان جو پہلے پرانے رئیس کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اب لالہ صاحب نے اپنے خاص عزیز کو کرائے پر دے دیا۔ پہلے تو لالہ جی نے اپنے خاص عزیز کے ذریعہ ہمیں یہ نیک مشورہ دینے کی کوشش کی کہ مکان پرانا ہے بال بچوں کا ساتھ ہے، بارش آرہی ہے اس میں رہنا خطرے سے خالی نہیں بہتر ہے کہ برسات سے پہلے ہم کہیں منتقل ہوجائیں ہم نے بہت ادب سے کہا کہ ہم غربت کے باوجود اپنی جان بچانے کی خاطر موجودہ کرائے سے دو گنا کرایہ دینے کو تیار ہیں لیکن دوسرا مکان تلاش کرنے کی ذمہ داری لالہ جی کے سر ہے جس دن وہ مکان تلاش کر دیں گے اس کی صبح ہی ہم منتقل ہوجائیں گے لیکن نہ لالہ جی مکان تلاش کر سکے اور نہ ہم دوسرے مکان میں منتقل ہوسکے۔

پہلے تو لالہ جی اور ان کے خاص عزیز نے بول چال بند کر دیا اس کے بعد حقہ پانی یعنی نیچے کا نل دن رات کھولے رہتے تاکہ اوپر پانی نہ جائے اور ہم نہ پانی پی سکیں نہ حقہ تازہ کر سکیں لیکن جب ہم بے تازہ کئے حقہ پینے اور بے نل کے پانی فراہم کرنے کے عادی ہوگئے تو انھوں نے کرایہ لینا بند کر دیا اور بجلی کا کنکشن کاٹ دیا ایک آدھ بار ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے منی آرڈر کیا۔ نہ لینے پر ہم بھی خاموش ہوگئے اور کرایہ کا روپیہ جمع کر کے نیا کنکشن الگ لے لیا اس کے بعد لالہ جی نے کرایہ لینا اور دھونس دینا شروع کر دیا لیکن نہ ہم دھونس میں آئے نہ مکان خالی کیا مستعدی سے کرایہ دیتے اور صبر کے ساتھ دھونس سہتے رہے لالہ کے لالچ کے ساتھ مکان کی خستگی بڑھتی جارہی تھی برسات سر پر آگئی تھی اور مرمت کا کوئی ذکر نہ

تھا ہم نے مکان کی مرمت کے لئے لالہ جی کی وہ خوشامدیں کیں جو کوئی بے روزگار بڑے بابو سے ملازمت کے لئے بھی نہ کرتا لیکن لالہ جی نے نہ تو خود مرمت کرائی اور نہ ہمیں اجازت دی اس کے بعد ہم نے کرایہ دینا بند کر دیا اور مرمت کی نوٹسیں دینے لگے کچھ دن بعد لالہ جی نے تخلیہ مکان اور ہم نے مرمت مکان کا دعوا دائر کر دیا اور گھر کا معاملہ عدالت پہونچ گیا ہم نے کتابیں طاق پر رکھ کر کاغذات کا بستہ بغل میں دابا اور اسکول میں بچوں کو پڑھانے کے بجائے عدالت میں مقدمہ کی پیروی شروع کر دی کچہری اور وکیل جن کا منہ بھی نہ دیکھا تھا اب روزانہ اللہ کر انھیں سلام کرنے لگے ہم مقدمہ کی پیروی میں لگے ہوئے تھے اور لالہ ہمارے صحن کی چھت میں اندر ہی اندر کول کرنے میں لگے تھے مقدمہ کی سماعت سے پہلے صحن کی چھت زمین سے آ لگی وہ تو کہئے کہ ہم پہلے سے ہوشیار بھی تھے اور رات کو بارش کی وجہ سے بال بچے سب اندر کمرے میں لیٹے تھے ورنہ لالہ جی نے ہم لوگوں کو مکان سے منتقل کر کے قبرستان پہونچا دینے کا پورا انتظام کر دیا تھا۔

تھوڑے دنوں تک ہم اپنے بے در و دیوار کے نہیں بے چھت کے مکان میں سیڑھی لگا کر اس طرح آتے جاتے رہے جیسے ہم اپنے مکان میں خود چوری کرنے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اتفاق سے زینے کا دروازہ صحن کی چھت پر تھا اور جب چھت ہی نہ رہی تو زینہ کس کام کا ایک رات جب ہم اپنے مکان میں سیڑھی لگا کر چڑھ رہے تھے تو پولیس والے نے زور زور سے کھنکھارنا شروع کر دیا ابھی اپنے حواس بھی بجا نہ کر پائے تھے کہ وہ سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلانے لگا۔ ادھر پاؤں ڈگمگائے اور ہم لڑھک کر سڑک پر آ گئے اسکے بعد گھر والے چیخے محلے والے ہمدردی کرنے اور پولیس والے تحقیقات کرنے لگے۔ صورت حال معلوم کرنے کے بعد ہمارے ساتھ پولیس والے بھی شرمندہ ہوئے اور ہدایت کی کہ بانس کی سیڑھی کے بجائے لکڑی کا

زینہ لگا لیجئے ورنہ کہیں کسی دن مکان جانے کے بجائے جیل یا اسپتال نہ جانا پڑے اس کے بعد ہم بانس کی سیڑھی کی جگہ لکڑی کا زینہ لگا کر آنے جانے لگے اور اب اتنی مشق ہو گئی ہے کہ اگر مکان خالی کرنا پڑتا تو اس زینے کے ذریعے چاند پر پہونچ سکتے تھے جہاں مکان کی ابھی اتنی قلت نہیں۔

لیکن یہ معلوم کر کے آپ کو خوشی ہو گی کہ لالہ جی کی تخلیہ کی درخواست خارج ہو گئی کیونکہ ہم اس مکان کے اتنے پرانے کرائے دار ہیں جتنا کہ پرانا مکان ہے اور جس طرح مکان دار پرانے مکان کی مرمت نہیں کراتا اسی طرح قانون پرانے کرائے دار کو گھر سے نہیں نکالتا۔ چنانچہ نہ گھر کا تخلیہ ہو سکا اور نہ مکان کی مرمت۔ دوسرا سال شروع ہو رہا ہے اور ہماری مرمت مکان کی درخواست نے صرف اتنا سفر طے کیا ہے کہ وہ عدالت کی میز سے اتر کر کمیشن کے ہاتھ میں آ گئی ہے جو فیس پہلے لے گا اور موقع کا معائنہ بعد کو کرے گا۔ اور خیال یہ ہے کہ رپورٹ اس وقت پیش کرے گا جب ہمارا جنازہ کچہری کے سامنے سے ہوتا ہوا قبرستان کو جا رہا ہو گا اس کے بعد وہ مراسلہ میز پر رکھ کر اس طرح واپس ہو گئے جیسے کہ لوگ مٹی دے کر قبرستان سے واپس ہو رہے ہوں اب جو میں نے گھوم کر دیکھا تو میرے دوست بھی غائب تھے۔

بعد کو پتہ چلا کہ مکان دار کے مظالم کا حال سن کر انھوں نے تلاش مکان کا خیال ترک کر دیا اور لاپتہ ہو گئے۔

نیا شوق

نیا زمانہ ہے۔ نو نئے نئے شوق بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ پرانے زمانہ میں لوگوں کو کشتی بازی، پتنگ بازی اور بٹیر بازی کا شوق ہوا کرتا تھا۔ اب عشق بازی کی جگہ پارٹی بازی، بٹیر بازی کی جگہ الکشن بازی اور پتنگ بازی کی جگہ اخبار بازی نے لے لی ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ ان تینوں بازیوں کے مارے ہوئے لوگوں کی نظر عنایت اخبار والوں پر پڑتی ہے۔ جہاں تک پارٹی بازوں اور الکشن بازوں کا تعلق ہے۔ ان کی سرگرمیوں سے تو آپ سب لوگ کچھ نہ کچھ واقف ہیں لیکن اخبار بازوں یعنی نام چھپوانے کے شائقین کی سرگرمیوں سے آپ لوگ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے کیوں کہ یہ لوگ جلوس نکالنے اور نعرے لگانے کے بجائے اپنا زیادہ وقت اخبار کے دفتروں کے چکر لگانے اور اخبار والوں کا گھیراؤ کرنے میں صرف کرتے ہیں۔

نام چھپوانے کا شوق پڑھے لکھے لوگوں کی وہ عام کمزوری ہے جس میں تقریباً ۹۰ فیصدی لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ نہ معلوم چھپے ہوئے الفاظ میں کیا جادو ہوتا ہے کہ اپنا لکھا ہوا مضمون پہلے پہل اگر کسی اخبار یا رسالے میں چھپتا ہے تو دل اسے پڑھنے اور دیکھنے کے لئے ایسا بے اختیار ہو جاتا ہے، جیسے جدائی کا مارا عاشق ناشاد اپنے دلدار کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ جو بیچارے مضمون نہیں لکھ پاتے، لیکن اپنا چھپا ہوا نام دیکھنے کا بے پایاں شوق دل میں رکھتے ہیں ان کی حالت قابل رحم

ہوتی ہے۔ میری نظر سے نام چھپوانے کے ایسے شوقین گزرے ہیں کہ پٹنے پٹانے کے خطرے کی پرواہ کیے بغیر بھرے جلسے میں تن تنہا مخالفت کے لیے اس امید موہوم میں کھڑے ہوجاتے ہیں کہ شاید اخبار کے رپورٹروں کی نظر عنایت ان کی طرف بھی ہوجائے اور دوسرے دن انھیں اپنے نام کا جلوہ اخبار کے کالموں میں نظر آجائے۔ نام چھپوانے کا شوق بیتا مار کہ لوگوں میں اسی شدّت سے پایا جاتا ہے جس شدت سے نفع بازوں کو نفع کا شوق، جس کے لیے وہ انسانیت کا گلا گھونٹ کر لوگوں کو لید تک کھلانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ یہی حال نام چھپوانے کے رسیا نیتاؤں کا ہوتا ہے کہ چاہے بڑھاپے اور گٹھیا کے مرض سے بغیر درد کے بستر سے نہ اٹھ پاتے ہوں لیکن نام چھپوانے کے شوق میں جلسے کی صدارت کے لیے جان پر کھیل کر ضرور پہنچ جائیں گے اور بولنے کی تاب نہ ہونے کے باوجود تقریر ضرور کریں گے۔

نام چھپوانے کے بعض شائقین اس تاک ہی میں رہتے ہیں کہ شہر میں کوئی بھولا بھٹکا شاعر یا ادیب آجائے اور یہ اپنے گھر پر ادبی نشست منعقد کرکے اخبار میں اپنا نام چھپوانے کے مستحق ہوجائیں۔ مراسلوں کے ذریعہ نام چھپوانے کی تکنیک کافی پرانی ہوچکی ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بے کار ہے۔ اخبار والوں کو ایسے نیک دِل لوگوں سے کافی چوکنا رہنا پڑتا ہے! جو یہ پرس کس کا ہے؟ اور یہ فاؤنٹن پن کس کا ہے؟ کے بہانے نام چھپوانے کی دیرینہ تمنا پوری کرنے کے لیے اپنا ہی پرس، فاؤنٹن پن لئے ہوئے دفتر میں آتے ہیں اور معصومیت سے کہتے ہیں صاحب پڑی ہوئی چیز ایسی امانت ہے کہ جسے مالک تک پہنچائے بغیر کھانا حرام ہوتا ہے اس لیے سیدھا آپ کے دفتر آیا ہوں کہ کسی طرح جلد اس کے بار سے سبکدوش ہوجاؤں۔ لکھ دیجیے کہ جن صاحب کا یہ پرس ہو، وہ نشانی بتاکر خاکسار مسمّی فلاں کے غریب خانے محلہ فلاں سے لے جائیں اس کے بعد کنکھیوں سے یہ

دیکھ کر اطمینان کر لیتے ہیں کہ نام کے بجائے کہیں خاکسار ہی تو نہیں لکھ دیا گیا ہے
ایک صاحب۔ جن سے صرف دُور کی صاحب سلامت تھی انھوں نے اپنی شادی خانہ آبادی کی تقریب میں شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیجا اور گھر پر آکر شرکت کے لیے اصرار بھی کیا ان کے اس اخلاق سے اپنی جگہ کچھ شرمندگی سی محسوس کرنے لگا کہ دیکھو بیچارے کو اتنا خلوص ہے اور میں اب تک ان سے دُور کی صاحب سلامت ہی سمجھتا رہا، شادی کے دن اپنا کام حرج کر کے خاص طور پر شرکت کے لئے گئے۔ لیکن کھانے کے بعد رخصت ہوتے وقت جب ان کے بڑے بھائی صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ کہا کہ شادی کی خبر کل کے اخبار میں تو آہی جائے گی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں دعوت کھانے نہیں رشوت کھانے آیا تھا۔ اس کے بعد طبیعت اتنی بدمزہ ہوئی کہ اس روز دفتر ہی نہ جا سکا اور بیچارے کا سارا خلوص اکارت گیا۔

نام چھپوانے کے شوق کے بارے میں اب جو واقعہ بیان کرنے جا رہا ہوں اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ نام چھپوانے کی لت بھی شراب وغیرہ کی لت سے کسی طرح کم نہیں۔ جس طرح شراب کے نشے میں آدمی کو کسی قسم کا لحاظ اور احساس باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح شاید نام چھپوانے کے شوق میں بھی آدمی کا دماغ بیکار ہو جاتا ہو۔

میرے جاننے والوں میں ایک صاحب جو کافی حیثیت والے ہیں اور کچھ ایسے بے پڑھے لکھے بھی نہیں۔ اُن کے بھائی عرصے سے بیمار تھے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ بے چارے کا انتقال ہو گیا۔ میں تعزیت کے لیے اپنے دوست کے گھر جانے ہی والا تھا کہ دیکھا وہ خود ہی آرہے ہیں۔ میں دیکھتے ہی لپکا اور آگے بڑھ کر ان سے ہمدردی ظاہر کی اور ایسے موقعوں پر جو الفاظ کہے جاتے ہیں جیسے اللہ مرنے والے کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، سوگوار لہجے میں دہرائے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

آج وہ کل ہماری باری ہے۔

اس پر وہ یہ خیال کرکے کہ موت کہہ کر تو آتی نہیں ممکن ہے کہ کل واقعی ایڈیٹر صاحب کی باری آجائے تو نام چھپوانے کا یہ نادر موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اس لیے انھوں نے مجھے تعزیت کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ اور جیب سے ایک پرچہ نکال کر میری طرف بڑھایا اور کہا کہ آپ کی آسانی کے لیے مرحوم کے مرنے کی اطلاع تحریر کردی ہے۔ میں نے پرچہ کھول کر دیکھا اس میں لکھا تھا کہ عامر مرزا کے بھائی عادل مرزا کا انتقال طویل علالت کے بعد ان کی قیام گاہ مرزا منزل میں کل رات ہوگیا۔ عادل مرزا کے انتقال کی خبر میں ان کے بھائی عامر مرزا کے ذکر کی ضرورت پہلے میری سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن جب انھوں نے لجاجت سے کہا کہ میں نے خبر خود ہی مختصر لکھی ہے اب اس میں کانٹ چھانٹ نہ کیجیے گا تو اس کی ضرورت فوراً میری سمجھ میں آگئی اور جب میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر صاف لکھا تھا کہ دیکھیے میرا نام نہ کٹنے پائے!

لیکن شاید کاتب صاحب کو عامر مرزا کی اس بے تکی طرح نام چھپوانے کی کوشش بری لگی اور جھنجھلاہٹ میں ان کے قلم نے عادل مرزا کے بجائے عامر مرزا کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خبر اس طرح شائع ہوئی عادل مرزا کے بھائی عامر مرزا کا انتقال طویل علالت کے بعد ان کی قیام گاہ مرزا منزل میں کل رات ہوگیا۔ صبح جب میری نظر خبر پر پڑی تو میرے حواس گم ہوگئے اور اس خیال سے کانپ اٹھا کہ عامر مرزا اپنی زندگی ہی میں موت کی خبر پڑھنے کے بعد کہیں بھوت بن کر میرے سر پہ سوار نہ ہوجائیں۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازہ پر اس زور سے کھڑکھڑایا کہ میں اچھل پڑا اور ایک سکنڈ کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ واقعی وہ بھوت بن کر آگئے ہیں لیکن

میں نے اپنے کو سنبھالا اور معذرت کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرتا ہوا ڈرتے ڈرتے دروازے پر گیا لیکن میں نے دیکھا کہ اپنے مرنے کی خبر اخبار میں پڑھ کر ان کے چہرے پر غصے کے بجائے ایک طمانیت سی تھی لیکن میں نے اسے ان کے صبر و تحمل پر محمول کیا اور معذرت کے لیے ذہن میں الفاظ تولنے لگا۔ لیکن تول سے پہلے ہی انھوں نے ڈنڈی مار دی اور اخبار میں ایک مرتبہ اور نام چھپنے کے خیال سے خوش ہو کر بولے کہ اب تو آپ کو یہ چھاپنا ہی پڑے گا کہ "عامر مرزا نہیں بلکہ عامر مرزا کے بھائی عادل مرزا کا انتقال ہوا ہے۔ ایک طرف وہ اس لیے خوش تھے کہ ان کے عزیز اور احباب ان کی موت کی خبر پڑھ کر تعزیت کے خطوط لکھنے سے پہلے ان کا نام ایک مرتبہ پھر اخباری میں چھپا ہوا دیکھ لیں گے۔ دوسری طرف ہم اس لیے خوش تھے کہ ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

ہواخوری

جس طرح مسجد اور مندر میں عام طور پر ادھیڑ عمر کے لوگ بڑی پابندی سے آتے ہیں تاکہ پچھلی لغزشوں کی تلافی کرکے اپنی عاقبت سنوار لیں اسی طرح غالباً سن ڈھلتے ہی لوگوں کو صحت بنانے کی فکر زیادہ ہوجاتی ہے اس لئے ہواخوری کے لئے آنے والوں میں اکثریت نیند کے ماتے نوجوانوں کی نہیں، بے خوابی کا شکار بوڑھوں کی ہوتی ہے جو بیچارے رات بھر شاید اسی انتظار میں کروٹیں بدلا کرتے ہیں کہ کب صبح ہو اور کب ہواخوری کے لیے نکلیں ان کے لئے ہواخوری مے نوشی کی لت سے کم نہیں ہوتی اس لئے کہ اگر وہ ایک روز بھی ٹہلنے نہ جائیں تو ان کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے اور جمائیاں آنے لگتی ہیں۔

لیکن جس طرح بادہ نوشی تنہائی میں مزا نہیں دیتی اسی طرح یہ لوگ بادپیمائی بھی تنہا پسند نہیں کرتے اور شاید خودخوری کی طرح تنہا ہواخوری بھی بُری سمجھتے ہیں اسی لئے ہواخور اکثر ٹولیوں میں ٹہلنے آتے ہیں۔ یہ ٹولیاں عام طور پر ایک ہی طرف کے محلے ٹولے کے ہم عمروں اور ہم مشربوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہندو یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی ہندو ہوٹل، اور مسلمان ہوٹل ہندو پانی اور مسلمان پانی کی تفریق کے باوجود خدا کا شکر ہے۔ ہندو ہوا اور مسلم ہوا کی ہوا ابھی نہیں چلی ہے اور ہندو اور مسلمان سب مل کر ایک ساتھ ہواخوری کرتے ہیں اسی لئے ان ٹولیوں کے ممبران

بلا تفریق مذہب و ملت ایک ساتھ ٹہلنے آتے ہیں اور چھوت چھات بھول کر ایک ہی فضا میں مل جل کر ہوا خوری کا مزا لیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ راجہ جی اور مسٹر سانی کی مخالفت کے باوجود ہم باہمی یکجہتی کے تو قائل ہیں لیکن باہم، ہوا خوری کے لئے ہم ابھی تک اپنے کو تیار نہیں کر پائے ہیں اسی لئے پرانے ہوا خور ہونے کے باوجود کسی ہوا خور ٹولی کے ساتھ لوہیا جی کی طرح زیادہ دیر تک ساتھ نہیں سکے۔ بات یہ ہے کہ ہم ہوا خوری کو صرف جسمانی صحت کے لئے ہی مفید نہیں سمجھتے بلکہ اسے دماغی سکون کا ذریعہ بھی خیال کرتے ہیں اور جس طرح غم خوری میں غالب صاحب کی غیرت غیر کی شرکت گوارا نہیں کر سکتی تھی، اسی طرح ہوا خوری میں میری عزلت پسند طبیعت کسی دوسرے ہوا خور کی موجودگی برداشت نہیں کر پاتی۔ جس کی وجہ سے بعض وقت بڑی دقت پیش آجاتی ہے۔

میں سردی کے موسم میں کانوں پر مفلر لپیٹے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے صبح کے دھندلکے میں آنکھیں چراتے ہوئے تاروں اور انگڑائیاں لے کر منہ سے بغل ہٹاتے ہوئے سورج کا نظارہ کرتا، چڑیوں کا نغمہ سنتا اور کلیوں کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹہل رہا ہوں کہ اچانک پیچھے سے ایک ساتھ السلام علیکم اور آداب عرض کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ پتہ چلا آنے والی ٹولی میں جان پہچان کے بزرگ بھی ہیں اور دوست بھی۔ اب عجیب گومگو کے عالم میں ہو جاتا ہوں۔ ان کے ساتھ چلوں تو سیر کا سارا ستیاناس ہوتا ہے نہ ساتھ چلوں تو اس بداخلاقی کی جرأت کہاں سے لاؤں۔ چنانچہ چلوں یا نہ چلوں کی گومگو میں تھوڑی دور بلا ارادہ ساتھ چلتا رہتا لیکن ریل کے ڈبے کی طرح سب کے ساتھ گھسیٹے رہنا اور سیر کے بجائے ساتھیوں کے پیچھے

پر خود بھی تال سے تال ملا کر ہنسنا، قومی، بین الاقوامی اور پھر مقامی سیاست پر بحث میں خواہ مخواہ ہوں، ہاں کر کے حصّہ لینا ناقابل برداشت ہونے لگتا ہے اس لئے میں ساتھ چھوڑنے کے لئے بہانہ تلاش کرنے لگتا ہوں۔ اب اگر اتفاق سے اس درمیان کوئی صاحب مخالف سمت سے ٹہلتے ہوئے ادھر سے گزرے تو میں ان کے ساتھ اس طرح ہو لیتا ہوں جیسے وہ میرے گہرے دوست ہیں لیکن تھوڑی دور ان کے پیچھے ٹہلنے کے بعد اس لئے رک جاتا ہوں کہ اپنے ساتھ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی کے ساتھ بھی نہ ٹہلوں۔ میرے خیال میں صنعتی دور کی ہنگامہ خیز زندگی میں گرمیٔ محفل کے بجائے گوشۂ عزلت کا ملنا زیادہ مشکل ہو گیا ہے اس لیے وہ چند گھنٹے بڑے قیمتی ہوتے ہیں جو تفریح کے بہانے تنہائی میں گزارے جائیں۔

لیکن کچھ لوگ ہوا خوری کے دلدادہ ہونے کے باوجود ہوا خوری برائے ہوا خوری کے سخت مخالف ہوتے ہیں اور وہ ادب برائے زندگی کی طرح تفریح برائے توسیع ملاقات کے قائل ہوتے ہیں اور سامنے سے آنے والے ہر ہوا خور کو ہنستے ہوئے سلام کرنا آداب ہوا خوری کا ضروری جز خیال کرتے ہیں چنانچہ ان کے ساتھ تفریح کے لیے جانے کا مطلب سیر کرنا نہیں بلکہ سیر کرنے والوں کو سلام کرنا ہوتا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس نیک عادت کی وجہ سے ان کے سیکڑوں شناسا ہو گئے ہیں اور جب کبھی انھیں کسی دفتر، محکمے یا عدالت میں جانا ہوتا ہے تو وہاں ان کا کوئی نہ کوئی شناسا ضرور نکل آتا ہے اور مہینوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی تفریحی شناسائی کا تجربہ ارادتاً نہیں بلکہ بلا ارادہ ایک مرتبہ مجھے بھی ہوا۔ میں ریزیڈنسی میں ٹہل رہا تھا کہ سامنے سے ایک صاحب سوٹ بوٹ سے لیس چھڑی ہلاتے چلے آرہے تھے۔ ہم اور وہ ہم باری نہیں سلام باری کے

رنج میں سوچ رہے تھے کہ اتفاقاً میری پیشانی میں کچھ کھجلی سی محسوس ہوئی اور میں نے کھجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا جسے وہ نیک دل ہوا خور سلام سمجھے اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ دوسرے دن جب وہ ملے تو ان بیچارے نے خود پہل کی اور میں نے نہایت خلوص کے ساتھ مسکرا کر جواب دیا۔ اب تقریباً روزانہ سلام اور جوابی سلام ہوتا رہا۔ اور سلاموں اور مسکراہٹوں کے تبادلہ سے برابر تعلقات بڑھتے گئے اس طرح نام اور پتے سے ناواقفیت کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کافی واقف ہو گئے۔ اتفاقاً جب وہ ایک دن اخبار کے دفتر میں تلاش گم شدہ کا اشتہار دینے آئے تو رنج کے باوجود مجھے دیکھتے ہی ان کا چہرہ ایسا کھل گیا جیسے کسی بچھڑے ہوئے پرانے دوست سے اچانک ملنے کے بعد کھل جاتا ہے اور میں بھی بلا ارادہ ان کے بچے کی گمشدگی کی تفصیلات اتنی دلچسپی سے دریافت کرنے لگا جیسے کہ وہ بچہ میرے کسی قریبی دوست کا ہو۔

تفریح کے سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ ہوا خوری کے لئے کم اور بڑے لوگوں سے ملاقات کا موقع نکالنے کے لئے زیادہ آتے ہیں۔ ایک ریاستی وزیر جو بچارے سیاسی تکڑم بازی کے بجائے ہوا خوری کے زیادہ عادی تھے (شاید اسی لیے وہ زیادہ دنوں تک وزارت کی گدی پر ٹک نہ سکے۔) اپنی وضعداری میں وزارت کی گدی مل جانے کے باوجود بڑی پابندی سے صبح سویرے سیر کے لئے نکل پڑتے لیکن برا ہو وزارت کا کہ بیچارے جب تک وزیر رہے ایک دن بھی سکون کے ساتھ سیر نہ کر سکے ان کا گھر میرے راستے میں پڑتا تھا اس لئے جب میں ہوا خوری کے لئے نکلتا تو مجھے صبح کے دھندلکے میں ایسا محسوس ہوتا کہ کچھ لوگ ان کے مکان کے آس پاس منڈلا رہے ہیں پہلے تو میں نے کوئی

توجہ نہ کی لیکن جب رفتہ رفتہ منڈلانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی تو میں بھی چوکنا ہوا اور میں نے نظر رکھنی شروع کی تو میں نے دیکھا کہ یہ وزیر صاحب جب گھر سے باہر نکلتے تو چیدوں کی طرح چاروں طرف دیکھ لیتے کہ کوئی ان کی تاک میں تو نہیں کھڑا ہے۔ اس کے بعد وہ تفریح کے لیے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے چلنے لگتے لیکن چار قدم چلنے کے بعد انھیں محسوس ہوتا کہ کوئی صاحب ان سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ان کا پیچھا کر رہے ہیں معلوم نہیں تفریح کے شوق میں یا پیچھا کرنے والے صاحب سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان کی رفتار اور زیادہ تیز ہو جاتی ابھی یہ دوڑ بھاگ جاری ہوتی کہ موڑ پر پہنچتے پہنچتے بغل والی گلی سے اچانک کوئی صاحب نمسکار کا بم اس طرح ان پر پھینکتے کہ جیسے وہ اس شخص کے لیے بڑی دیر سے موڑ پر مورچہ سنبھالے کھڑے تھے اس دو طرفہ حملے سے بچارے وزیر صاحب ایسے بوکھلا جاتے کہ انھیں نمسکار کا جواب دینا بھی مشکل ہو جاتا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ دونوں حملہ آور ان کے باڈی گارڈ کی طرح ان کے اغل بغل قدم ملا کر چلنے لگتے۔

راستے میں موسم پر باتیں ہوتیں یا سیاست پر اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں سیر کو سیاست کے سائے سے دور رکھنے کا سختی سے قائل ہوں جوں جوں وہ بڑھتے جاتے ان کے اردگرد بھیڑ بڑھتی رہتی اور روانگی کے وقت تک وہ ایک جلوس کی شکل اختیار کر لیتی اس کے کچھ دنوں بعد میں نے دیکھا کہ ان بچارے نے شاید ہوا خوروں کے حملے سے بچنے کے لئے ہوا خوری ہی ترک کر دی جس کا غالباً ان کی صحت پر ایسا برا اثر پڑا کہ وہ جلد ہی وزارت سے استعفا دینے پر مجبور ہو گئے۔ اور اب وزارت کے بار سے سبکدوش ہونے کے ساتھ ساتھ ہوا خوروں کے حملے سے بھی نجات پا چکے ہیں اور سکون کے ساتھ پھر ہوا خوری

کرنے لگتے ہیں۔

یہ تو تھے ہوا خور وزیر ہند ان کے ہوا خواہوں کے حملے اب ذرا ہوا خور مولانا پر معتقدین کے حملوں کا منظر بھی دیکھتے چلیے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے مولانا ہوا خوری تفریحاً نہیں بلکہ علاج کے طور کرتے تھے اور ان کی کمزور صحت، ہوا خوری کے وقت ان کے نادان معتقدوں کے حملوں کو زیادہ دن برداشت نہ کر پاتی تھی اسی لئے شاید وہ دم لینے کے لئے درمیان میں ایک آدھ دن کا ناغہ ضرور کر دیتے تھے۔

میں نے بارہا دیکھا کہ مولانا نماز وغیرہ سے فراغت کے بعد ہوا خوری کے لئے نکلے ابھی وہ بچارے دس بیس قدم بھی نہ جا پائے ہوں گے کہ برابر کی گلی سے ایک صاحب بغل میں دودھ کی بوتل دبائے ہوئے نمودار ہوئے اور انھوں نے دور ہی سے السلام علیکم کا بم اس طرح پھینکا کہ لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ وہ بغل میں دودھ کی بوتل لئے ہوئے تھے یا دستی بم اور مولانا بھی اس اچانک حملے سے کچھ سہم سے گئے لیکن صورت حال کے اندازے کے بعد سنبھل گئے اور پرخلوص انداز میں جواب دے کر آگے بڑھنے لگے لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ بلکہ معتقد صاحب دودھ کے لئے لائن میں لگنے کے بجائے جھپٹ کر مولانا سے مصافحہ کا شرف حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے مولانا اخلاقاً کھڑے ہو گئے اور اپنے اوور کوٹ کی گرم جیبوں سے ہاتھ نکال کر ان کے ٹھنڈے ہاتھوں کو گرمی اخلاق سے گرم کرنے لگے۔

مصافحہ نہیں مداخلت فی التفریح سے نپٹنے کے بعد مولانا تھوڑی ہی دور بڑھے ہوں گے کہ سامنے سے تقریباً نصف درجن ہوا خوروں کی ایک ٹولی آتی نظر آئی۔ مولانا کی آنکھوں میں تکلیف رہتی ہے اس لئے شاید وہ اس خطرے کو بھی

محسوس نہ کر پائے ہوں لیکن اس ٹولی کو دیکھ کر جس میں مولانا کے کچھ معتقدین بھی شامل تھے میری زبان سے بے ساختہ نکل پڑا جل تو جلال تو مصافحے کی بلا ٹال تو لیکن وہ بلا ہی کیا جو ٹالے ٹل جائے۔ ابھی مولانا کچھ دور ہی تھے کہ ایک دم صبح کی خاموش فضا اسلام علیکم کی آواز سے گونج اٹھی اور بیچارے مولانا گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ابھی وہ سلام کا جواب بھی نہ دے پائے تھے کہ ایک صاحب نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اب کیا تھا باری باری معتقدوں نے تو مصافحہ کیا ہی لیکن دوسروں نے بداخلاقی کے الزام سے بچنے کے لئے ان سے زیادہ گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ نصف درجن مصافحوں کے بعد مولانا کی کافی تفریح ہو گئی اس لئے وہ سوچنے لگے کہ وہ مزید تفریح کے لئے آگے بڑھیں یا گھر لوٹ جائیں لیکن شاید اس خیال سے کہ اگر لوٹ پڑیں گے تو پوری ٹولی ان کے ساتھ ہوگی اس لئے انھوں نے آگے قدم بڑھایا ابھی وہ دو ہی چار قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ ٹولی میں سے ایک صاحب جنھیں مولانا سے خاص عقیدت تھی انھوں نے مولانا کا اکیلے جانا مناسب نہ خیال کیا اور باڈی گارڈ کی طرح پیچھے لگ گئے لیکن مولانا کے دل میں سوائے خوفِ خدا کے کسی اور کا خوف نہ تھا اس لئے انھیں اپنے معتقد کی یہ خدمت بے وجہ معلوم ہوئی اور انھوں نے تفریح کا خیال ترک کر دیا اور گھر واپس آ گئے۔

خیر بے تکلف دوستوں کے ساتھ تفریح کے لئے جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بے تکلف دوستوں کے بجائے خوفناک کتوں کے ساتھ تفریح میری سمجھ سے باہر ہے شاید دن چڑھے تک مسہری پر انگڑائیاں اور جمائیاں لیتی ہوئی لیلیٰ کے ساتھ تفریح کا شرف نہ حاصل ہو سکنے کی وجہ سے یہ سبزہ نوردِ مجنوں سگِ لیلیٰ ہی کی صحبت کا لطف اٹھانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان مجنوں صفت ٹہلنے والوں کے ساتھ آنے

والے کتے بھی بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اتنے خوفناک ہوتے ہیں کہ دوسرے تفریح کرنے والے چوکنا رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو صاحبان کتوں کو ساتھ لے کر تفریح کرنے آتے ہیں اگر ان کا مقصد خود ٹہلنا نہیں بلکہ کتوں کو ٹہلانا ہوتا ہے تو ان سے درخواست ہے کہ انھیں یہ کام ایمان داری سے کرنا چاہیئے اور بچوں کو ٹہلانے والی آیاؤں کی طرح بے پرواہ ہو کر کتوں کو دوسروں کا پیچھا کرنے کے لئے آزاد نہیں چھوڑ دینا چاہیئے اس لئے کہ ان کا السیشین چاہے جتنی نیک نیتی سے دوسرے ہوا خوروں سے خلوص برتے انھیں اس کی قربت سے سکون کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے ایک صاحبہ جو شاید خود نہیں بلکہ اپنے کتوں کو ٹہلانے کے لئے صبح کے دھندلکے میں بڑی پابندی سے نکلتی ہیں وہ اپنے منہ زور کتے کی زنجیر بڑی مضبوطی سے پکڑے رہتی ہیں اور کتے کو دوسروں کی تفریح میں خلل ڈالنے کے لئے تنہا چھوڑنے کے بجائے اپنی تفریح ترک کر کے کتے کی مرضی کے مطابق وہ انھیں جدھر لے جانا چاہتا گھسٹتی ہوئی اسی کے ساتھ چلی جاتی ہیں لیکن زنجیر کی گرفت نہیں ڈھیلی کرتیں۔ اگر خدانخواستہ دوسرے کتا بردار تفریح کرنے والوں کی طرح وہ بھی لاپرواہی برتیں تو ہمارا خیال ہے کہ ان کا یہ منہ زور ہوا خور کتا دوسرے امن پسند ہوا خوروں کا گھر سے نکلنا اسی طرح مشکل کر دیتا جس طرح چین نے اپنے امن پسند ہمسایوں کا پُر سکون زندگی بسر کرنا مشکل کر دیا ہے۔

جس طرح مختلف قسم کے ہوا خور ہوتے ہیں اسی طرح ان کی ہوا خوری کے مختلف اوقات بھی ہوتے ہیں، بعض شب بیدار ہوا خور تو ایسے ہوتے ہیں جو تاروں کی چھاؤں ہی میں ٹہلنا پسند کرتے ہیں اور تاروں کی واپسی سے پہلے خود تفریح سے واپس آجاتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ رات کے اندھیرے میں گل گشت

کرنے والے ان ہواخوروں کو دیکھ کر ریزیڈنسی کے قریب سے گزرنے والے بعض کمزوردل راہگیر مردہ انگریزوں کے کفن رونی مانگنے والے سائے سمجھ کر بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ جب کبھی ہم جلد سیر کے لئے نکل پڑے اور ہمیں احساس ہوا کہ ابھی کافی اندھیرا ہے اور ہم سنسان سڑک پر چوکنا ہو کر چلنے لگے تو بعض مرتبہ تاروں کی چھاؤں میں تفریح سے لوٹنے والے ان ہواخوروں کے اچانک نمودار ہوجانے سے ہمارا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہا۔

ان کے بعد وہ سمجھدار ٹہلنے والے ہیں جو ڈوبتے تاروں کا نہیں چڑھتے سورج کا ساتھ دیتے ہیں اور طلوع آفتاب کا لطف حاصل کرتے ہوئے دھوپ سخت ہونے سے پہلے گھر واپس آتے ہیں اس کے بعد اُن ٹہلنے والوں کا نمبر آتا ہے جن کا کہنا ہے کہ ہواخوری کوئی چوری نہیں، جو اندھیرے میں کی جائے اسی لئے وہ یہ نیک کام روز روشن کی روشنی میں کرتے ہیں اور مسواک کرتے ہوئے جب گھر واپس آتے ہیں تو انھیں ناشتے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا بلکہ ناشتہ خود ان کا انتظار کرتے کرتے ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔

جیسے آج کل کھانے کے نئے نئے طریقے نکلے ہیں اسی طرح ہواخوری کے بھی نت نئے ڈھنگ ہیں کچھ لوگ جو یوگ آسن کے شوقین ہیں وہ پاؤں اوپر اور سر نیچے کرکے ہواخوری کرتے ہیں اور اندھیرے میں ریزیڈنسی کے اندر انھیں اس حالت میں دیکھ کر ان پر ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مارے جانے والے انگریزوں کی کھڑی قبروں کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ بعض رشی منی قسم کے ہواخور برگد کے برگزیدہ درخت کے سایہ میں لمبی لمبی سانسیں لے کر ہواخوری کے ذریعہ نروان حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ہواخور، کوٹ اور جوتا اللہ کی راہ پر چھوڑ کر ان پر دلکی چال چلنے کی مشق کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض بیلی گارد کا اس

خضوع سے چکر لگاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ٹہل نہیں رہے ہیں طواف کر رہے ہیں کچھ فارغ البال حقیقی معنوں میں ٹہلنے آتے ہیں اور چھڑی ہلاتے ہوئے خراماں خراماں ریذیڈنسی کی کیاریوں میں اس شان سے گل گشت کرتے ہیں کہ شاہان اودھ کی روحیں انھیں رشک سے دیکھنے لگتی ہیں لیکن وہ تمام چیزوں سے بے نیاز ہوا خوری میں مشغول رہتے ہیں۔

بعض گرم مزاج لوگ ہوا خوری کے ساتھ ساتھ شبنم نوشی بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور سبزۂ خوابیدہ کی نازک پلکوں پر شبنم کے بکھرے ہوئے موتیوں کو اس بے رحمی سے روندتے ہیں کہ کلیوں کا سینہ پھٹنے لگتا ہے اور بلبلیں چیخ اٹھتی ہیں لیکن وہ اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک ان کے تلوے شبنم کو چوس کر سبزہ کا دامن ہماری جیب کی طرح خالی نہیں کر دیتے اسی لئے ہمیں ان بے رحم شبنم نوشوں سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس بے جوڑ سماج میں عام طور پر سابقہ انھیں سے پڑتا ہے جن سے آپ بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ فلک کج رفتار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہمارے ایک دوست سے کسی صاحب نے یہ شبنمی نسخہ بتا دیا کہ شبنم پر ننگے پاؤں چلنے سے اختلاج قلب اتنی دور بھاگ جاتا ہے جتنی دور دولت سچائی کے راستے پر چلنے سے بھاگ جاتی ہے اور تازہ شبنم آنکھوں میں لگانے سے بینائی اتنی بڑھ جاتی ہے جتنی منافع خوری سے تاجروں کی توند۔ اب کیا تھا ہمارے دوست نے اختلاج قلب کم کرنے اور بینائی بڑھانے کی دھن میں کڑاکے کے جاڑوں کی پروا کئے بغیر شبنمی نسخے کا استعمال شروع کر دیا ابھی دو چار ہی دن شبنم پر چلے ہوں گے کہ سارا اختلاج قلب نزلہ بن کر ناک اور آنکھوں سے ٹپکنے لگا۔ آنکھیں سوج گئیں اور ناک کے نتھنے ناک

چھینکتے چھینکتے زخمی ہو گئے۔

اور جب وہ دو ایک دن ٹہلنے نہ آئے تو ہمیں فکر لاحق ہوئی اور ہم ان کی مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر پہونچے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ وہ شبنم پر ٹہلنے کے بجائے چار پائی پر لیٹے بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے خیریت دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ بھئی سخت نزلہ ہوا ہے۔ دونوں وقت جوشاندہ پی رہا ہوں لیکن نزلہ کم نہیں ہوتا اور چھینکیں دم نہیں لینے دیتیں۔ تمہیں کوئی دوا بتاؤ کہ نزلہ سے نجات ملے۔ میں نے ہنسی روکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا کہ بھئی! سنا ہے کہ نہار منہ، صبح کے وقت شبنم پر ننگے پاؤں ٹہلنے سے نزلہ اس طرح بھاگ کھڑا ہوتا ہے جس طرح میونسپلٹی کی ٹرک دیکھ کر خونچے والے بھاگتے ہیں اس پر انھوں نے بگڑ کر کہا کہ آپ عیادت کرنے آئے ہیں یا میرا مذاق اڑانے۔ میں نے اسی طرح منہ سکھائے ہوئے کہا کہ یہ دونوں نیک کام اگر ایک ساتھ انجام پا جائیں تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ اب ان کا غصہ اور نزلہ دونوں برسنگ پوائنٹ پر پہنچ چکے تھے لیکن اللہ آڑے وقت پر اپنے نیک بندوں کی مدد کسی نہ کسی طرح کر ہی دیتا ہے چنانچہ ٹھیک اس وقت جب کہ وہ میرے اوپر ایٹم بم کی طرح پھٹنے ہی والے تھے کہ انھیں اس زور کی چھینک آئی کہ پورا کمرہ نزلہ کے جراثیم کی بھن بھناہٹ سے گونج اٹھا۔ اور میں "یرحکم اللہ" کہتا ہوا کمرے سے اس لئے بھاگ کھڑا ہوا کہ نزلہ "ہر عضو ضعیف" کے مطابق کہیں میں بھی نزلے کی زد میں نہ آجاؤں۔

یہ تو تھی اختلاج کی دوا اب ذرا ادھر کی دوا بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔ ایک مرتبہ میں صبح جلد ہی اٹھ پڑا اور سیر کے لیے چل کھڑا ہوا۔ ریزیڈنسی کے پاس پہونچا تو ابھی اچھا خاصہ اندھیرا تھا اور میں آگے بڑھتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ اچانک ریزیڈنسی

کی پرانی عمارتوں سے ٹکراتی ہوئی قہقہوں کی آواز سنائی دی اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسی زور کا قہقہہ ہوا۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے برابر قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں استنے میں اُدھر سے ایک صاحب آتے نظر آئے اور میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں ان سے دریافت کیا کہ صاحب یہ قہقہوں کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ وہ نہیں معلوم میری گھبراہٹ پر مسکرائے یا قہقہوں پر بہرحال انھوں نے ایک حکیم حاذق کے لہجے میں نہایت وثوق سے کہا کہ آپ کو نہیں معلوم قہقہہ سینے کے تمام امراض کے لیے تریاق کا کام کرتا ہے۔ سات دن تک کھلی ہوا میں قہقہوں کے سات ڈوز استعمال کرنے سے دمہ اور کھانسی دونوں کافور ہوجاتے ہیں۔

اس مجرب نسخے کے معلوم ہونے کے بعد میں نے ٹہلنا چھوڑ کر قہقہے لگانا شروع کر دیا۔ لوگ مجھے پاگل سمجھ کر میرا مذاق اڑانے لگے اور میں نے دمے اور کھانسی سے جلد نجات حاصل کرنے کے لیے قہقہوں کے ڈوز اور بڑھا دیے لیکن نہ میرے دمے میں کمی ہو رہی ہے، نہ لوگ مذاق کرنا بند کر رہے ہیں اور اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاید لوگ میرے متعلق ٹھیک ہی سمجھ رہے ہیں۔

صرف ۲۰ آنے کا سوال

اتوار کا دن تھا۔ گھڑی نے ٹھیک بارہ بجائے تھے۔ میں کھانا کھا کر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں لیٹ کر اخبار یا کتاب پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ نیند بلانے کے لئے پڑھتا ہوں اس لئے کہ نیند کو شاید یہ منظور ہے کہ وہ بس پڑھتے ہی وقت آتی ہے بار بار ہاتھ سے اخبار گر جاتا اور آنکھ کھل جاتی اور میں پھر وہی خبر پڑھنے لگتا جو میں نے بہت پہلے شروع کی تھی اور کئی بار پڑھنے کے باوجود نیند کی وجہ سے کچھ پلے نہ پڑا تھا۔

خبر غالباً یہ تھی کہ حکومت گداگری بند کرنے کے معاملے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ کمیٹی سب سے پہلے تو اس مسئلہ پر غور کرے گی کہ ہندستان میں گداگری کے وجوہ کیا ہیں کیونکہ یہاں گداگری صرف معاشی بدحالی اور جسمانی معذوری ہی کی بنا پر نہیں کی جاتی ہے بلکہ اپنی اس قیمتی وراثت کو محفوظ رکھنے کے لئے کی جاتی ہے جو بزرگوں سے ترکہ میں ملی ہے۔ دوسری بات جس پر کمیٹی کو غور کرنا ہوگا وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ سالہا سال کی ریاضت کے بعد کلاکار گداگروں نے اسے پیشے کی سطح سے بلند کر کے ایک آرٹ میں تبدیل کر دیا ہے اسے ختم کرنا مناسب ہوگا یا نہیں اور اس کا ملک کے فن کاروں پر کیا ردِ عمل ہوگا۔؟

ابھی میں یہ جزو ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ نیچے گلی سے صدا آئی کہ دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ اس صدا میں بلا کی بے نیازی، خود اعتمادی اور بھولا پن پایا جاتا تھا جس نے میری نیند کافور کر دی اور میں سائیں بابا کی زیارت کے لیے چارپائی سے اٹھ کر چھجے سے جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھوپ میں سڑک کے کنارے آنکھیں بند کیے منہ آسمان کی طرف اٹھائے کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک بورا کچھ خالی اور کچھ بھرا رکھا ہے اور ایک چھوٹا تھیلا پیروں کے پاس پڑا ہے اور وہ سانس لیے بغیر یہ صدا لگا رہے ہیں کہ دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے۔ جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ سائیں بابا کا حلیہ ہمارے دیس کی رنگا رنگ تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا جس میں ہر فرقہ کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ننگے پاؤں اونچی سفید تہبند اس پر بش شرٹ لیکن کثرت استعمال سے دونوں کا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال جو سیٹ اور زلف کی درمیانی منزل طے کر رہے تھے اور چکٹ جانے سے ان میں گھنگھریالے پن کا نوجوان پیدا ہو گیا تھا۔ داڑھی ایک مشت دو انگل سے زیادہ ہو کر شرعی حدود سے نکل کر زندگی کی حدود میں پہونچ گئی تھی۔ تدلا نبا جسم چھریرا چہرہ طباقی رنگ صاف اور دل کا حال خدا کو معلوم۔ یہ تھا سائیں بابا کا حلیہ جو نہ جانے کب سے فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھنے کے لیے ہماری گلی میں صدا لگا رہے تھے۔

ہماری گلی اپنی رنگا رنگ آبادی کی وجہ سے گلی نہیں گلدستہ ہے جس میں ہر قسم کے پھول لگے ہیں لیکن افلاس اور جہالت کی گرد سے میلے اور مرجھائے ہوئے ہیں ایک لائن میں مزدور، ترکاری والے، موچی، بڑھئی، پنساری اور سیو والے

دوسری لائن میں مہتر، دھوبی، جھکوا، پان والا اور دودھ والے رہتے ہیں۔ کوٹھوں پر دفتر کے بابو، اسکول کے ٹیچر، پرانے مولوی، نئے وکیل، مریض کے غم میں سوکھے حکیم اور شہر کے اندیشے میں دبلے اخبار نویس رہتے ہیں۔ ہماری گلی کا سب سے دلچسپ مشغلہ لڑائی ہے جس کا زور دن میں بارہ اور دو کے درمیان اور رات میں دس سے بارہ کے بیچ میں ہوتا ہے۔ جب مہتر تاڑی خانے سے لڑکھڑاتے اور کاروباری بوجھ سے چور گھر واپس ہوتے ہیں اور اپنا سارا اتکان اپنی گھر والی کی پتلی گردن پر اتارتے ہیں۔ ہماری گلی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کبھی چوری نہیں ہوتی اور جب کبھی کسی ناتجربہ کار چور نے ایسی گستاخی کی جرأت کی تو اڑنے سے پہلے گرفتار ہو گیا بات یہ ہے کہ گلی تپلی گنجان آبادی جس میں آدھی سے زائد آبادی سڑک کے کنارے سوتی کم اور لڑتی زیادہ رہتی ہے۔ اس لئے چور بھاگ کر جائے تو کیسے اور چوری کرے تو کیوں کر۔

لیکن اس گلی میں رات کے چوروں کے بجائے دن کے سینہ زوروں کا بڑا زور رہتا ہے اور کوئی ایسا ہی منحوس دن ہو گا جس دن کوئی پہنچے ہوئے فقیر اپنی کرامات دکھا کر یہاں کی بھوکی ننگی آبادی سے اپنا ٹیکس نہ وصول کرنے جاتے ہوں۔ ابھی چند منٹ ہوئے ایک پہنچے بزرگ "بھوکا ہوں اور ننگا ہوں کچھ رحم کرو کنجوسو!" کی دھمکی دے کر اپنا خراج کپڑے اور جنس کی شکل میں وصول کرنے جا چکے ہیں اور آج یہ بزرگ خالص نقدی کا سوال کر رہے ہیں۔ دیکھئے ان کی جھولی کس طرح بھرتی ہے۔

سائیں بابا یوں ہی صدا لگاتے رہے۔ گلی سے گزرنے والے لوگ ان کی طرف دیکھتے، کچھ دیر ٹھہرتے پھر مسکراتے اور چلے جاتے۔ محلہ کے کچھ لڑکے ضرور ان کے پاس جمع ہو گئے تھے لیکن سائیں بابا کے حلئے، پاٹ دار آواز اور انوکھی

صدا سے وہ کچھ سہمے ہوئے تھے اور سائیں بابا کے ساتھ انھیں کسی شرارت کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ محلہ کی عورتیں کوٹھریوں سے نکل کر چوکھٹ پر آگئی تھیں اور سائیں بابا کو ایک گھنٹے سے دھوپ میں برابر صدا لگاتے دیکھ کر ان کے دل میں ہم دردی اور خوف کے ملے جلے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ کوٹھوں پر سے لڑکیاں سائیں بابا کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں اور بوڑھیاں انھیں ڈانٹ رہی تھیں۔

سائیں بابا ایک گھنٹے کی لگاتار ریاضت سے کچھ تھک سے گئے تھے اس لئے انھوں نے دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا سوال ہے کے ساتھ کچھ تقریروں اور اشعاروں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تاکہ دم لے سکیں۔ تقریر میں ربط کم اور جذب زیادہ تھا اور یہی حال اشعار کا تھا۔ ایک مصرعہ ایک شعر کا اور دوسرا مصرعہ دوسرے شعر کا، لیکن دیوانہ بکار خویش ہشیار، کے مطابق مطلب کے لحاظ سے سب باموقع اور بامعنی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے سر کو خاص طرح سے جنبش دے کر کہنا شروع کیا۔

"یہ دنیا آنی جانی ہے۔ یہ دنیا رام کہانی ہے۔"

اور اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی جوڑ دیا کہ ؎

آج وہ کل ہماری باری ہے۔

اس کے بعد انھوں نے تقریر شروع کی اور کہنے لگے "دھن ہاتھ کا میل ہے۔ مسلی چھڑاتا بابے نہیں تپ ہے۔" اور اسی کے ساتھ انھوں نے جوڑ دیا۔ "رام رحیم ایکئے نام، دان دے دہی بھگوان" اس کے بعد انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے بڑے جوش سے سوال کیا۔ "اللہ ایشور کیا ہے اور کہاں ہے؟ آنکھ بند کر، دل میں ڈھونڈ جو ڈھونڈے گا وہ پائے گا۔"

اس کے بعد انھوں نے پھر وہی صدا لگانی شروع کی لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ یعنی سوال کو چندہ میں تبدیل کر دیا اور اب اس کی شکل یہ ہو گئی ۔

دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا چندہ ،

ایک ایک آنہ کر کے انھوں نے یہ تبدیلی غالباً آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کے بعد مزدوری خیال کی اور اب انھوں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ ترمیم شدہ صدا لگانی شروع کر دی ۔ اس ترمیم کا خاطر خواہ اثر پڑا اور کوٹھریوں کی چوکھٹ پر بیٹھی عورتیں جو سائیں بابا کی ریاضت سے کافی متاثر ہو چکی تھیں لیکن بیس آنے کی بھاری رقم عقیدت کی راہ میں روڑا بنی ہوئی تھی ۔ اس کے ہٹ جانے سے اب وہ چوکھٹ سے اتر کر سڑک پر آ گئی تھیں اور آپس میں کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ سائیں بابا کے لہجے میں اور زیادہ جلال پیدا ہونے لگا ۔ اور انھوں نے کہنا شروع کیا ۔ کتھا ہو گی یا نیلا دس چندہ دینے کو تیار ہو جائیں گے لیکن دنیا کے مالک کے چاہنے والے کی کتھا سننے والا کوئی نہیں پھر وہ اس طرح بڑبڑانے لگے

دھن وان کیا دے گا ، اس کا دل تھوڑا ہوتا ہے
غریب دے گا جس کی پونجی تھوڑی اور دل بڑا ہوتا ہے

اس کے بعد پھر انھوں نے صدا لگانی شروع کی " دنیا کے مالک کے نام پر صرف بیس آنے کا چندہ ۔ " تھوڑی دیر کے بعد دم لینے کے لئے انھوں نے پھر تقریر شروع کی اور کہنے لگے میں کسی سے بھیک نہیں مانگتا ۔ میں جو کچھ مانگتا ہوں اپنے بھگوان اور اللہ سے مانگتا ہوں جس کے دل میں جس کے ہر دے میں بھگوان اور اللہ بسا ہوگا وہ دے گا اور جس کے دل میں راون اور شیطان گھسا ہوگا وہ کیا دے گا ؟ اسکے بعد انھوں نے پھر گانا شروع کیا ۔

یہ دنیا آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے

اور گلی کی موڑ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آج وہ کل ہماری باری ہے

اور اسی وقت اسی طرف سے ایک لڑکا ہائے نانی چیختا ہوا بھاگا اور عورتوں نے جو مڑ کر دیکھا تو ایک بڑھیا زمین پر پڑی ہوئی ہے اس کے بعد سائیں بابا نے کڑاک دار آواز میں کہا جس کو دینا ہے دے ورنہ

"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"

اور اس کے بعد وہ سامنے پڑے ہوئے بورے کو اٹھانے کے لئے جھکے۔ اب عورتوں میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ کوئی دوپٹے کے پلو سے پیسے کھولنے لگی۔ کوئی جیب ٹٹول کر اکنی نکالنے لگی اور کوئی پٹاری الٹ پلٹ کر بچی کھچی ریزگاری تلاش کرنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے سائیں بابا کے سامنے اکنیوں اور پیسوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دو ایک کو لھے پر سے بچے ہاتھوں میں ایک روپے کا نوٹ اور چار آنے دبائے سائیں بابا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

سائیں بابا نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنی دو گھنٹے کی سخت ریاضت کی گاڑھی کمائی بٹور کر جھولے میں بھری اور جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا کہتے ہوئے غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی گلی کی موڑ پر پڑی بڑھیا بھی کنمنا کر کروٹیں بدلنے لگی، اور تھوڑی دیر میں اس لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے چلی گئی اس کے بعد میں نے ان تینوں کو پارک میں بیٹھے اور اپنی مشترکہ محنت کی کمائی بانٹتے اور جھگڑتے دیکھا۔

سفر فوبیا

ممکن ہے آپ لوگوں کے لیے سفر دلچسپی کا باعث ہو لیکن میرا تو یہ حال ہے کہ سفر کا ارادہ کرتے ہی سفر بھوت کی طرح سر پہ سوار ہو جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اترتا جب تک قدم ریل سے نیچے نہیں اترتے رات کی نیند اور دن کا کھانا حرام ہو جاتا ہے۔ آئے دن کے حادثوں کی بنا پر دل میں ایسا خوف سمایا ہے کہ رخت سفر باندھتے ہی بدن میں جھرجھری سی محسوس ہونے لگتی ہے اور یہ خیال آنے لگتا ہے خدانخواستہ یہ سفر، سفرِ آخرت نہ ثابت ہو۔

اب تصور کیجیے میری اس حالت زار کا، جب مجھے بدقسمتی سے ریل کا سفر، وہ بھی دور کا درپیش ہو یقین کیجیے کہ گھنٹوں پہلے نہیں، پہروں پہلے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ دل میں طرح طرح کے بُرے خیالات آنے لگتے ہیں۔ بیوی کی بیوگی اور بچوں کی یتیمی کی تصویر نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتی ہے اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ گلے مل کر جی بھر کے رو لوں۔ معلوم نہیں پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن فوراً ہی چونک کے منحوس خیال کو اپنے دماغ سے نکال پھینکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن دماغ کو ان برے خیالات کی بھنبھناہٹ سے کسی طرح نجات نہیں ملتی اور وہ ہر وقت ان کے نرغے میں رہتا ہے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ میں سفر کے معاملے میں غیر ضروری طور پر محتاط ہوں لیکن میرا

خیال ہے کہ اس پُر حوادث زمانے میں اتنی احتیاط تو ضروری ہے اور لوگوں کو خواہ مخواہ میرے متعلق یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میں سفر فوبیا کا شکار ہوں اسی لئے جب میں سفر کی تیاریاں شروع کرتا ہوں اور ایک آدھ دن پہلے ہولڈال میں سامان رکھنے اور کپڑے وغیرہ ٹھیک ٹھاک کرنے کو کہتا ہوں تو بیگم بھی اسے میری ہڑبڑاہٹ خیال کرتی ہیں اور تیاری میں تعاون کے بجائے میرا مذاق اڑانے لگتی ہیں اور جملے بازی شروع کر دیتی ہیں۔ عام حالات میں ہم خود کافی پُر مذاق آدمی ہیں اور مذاق پسند بھی کرتے ہیں لیکن جب سفر درپیش ہو اور پھر ریل کا سفر مزاج کا نارمل رہنا میرے خیال میں "اب نارمل" بات ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں بیگم کی جملے بازی ہمیں بعید بری لگتی ہے اور ہمارے رہے سہے حواس اور گم ہو جاتے ہیں۔

روانگی کے وقت تو ہماری اور بری حالت ہوتی ہے کانوں میں سیٹی کی آواز گھر ہی پر سنائی دینے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ریل سامنے سے چھک چھک کرتی چلی آ رہی ہے اور ہم ابھی بستر ہی باندھ رہے ہیں۔ بیگم کے اصرار پر جب ہم جاتے وقت کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو لقمہ حلق میں اس طرح اٹکنے لگتا ہے جیسے گریہ گلو گیر ہو رہا ہو۔ آخر کار ہم کھانا اسی طرح چھوڑ چھاڑ گاڑی کی آمد سے کئی گھنٹے پہلے گھر سے شاید اس خیال سے روانہ ہو جاتے ہیں کہ اگر گاڑی لیٹ ہو سکتی ہے تو قبل از وقت بھی آ سکتی ہے۔ اور چونکہ آج کل گاڑیوں کا لیٹ ہونا عام ہو گیا ہے اس لئے اس کے قبل از وقت آ جانے کے امکانات بھی بڑھ گئے ہیں۔

چنانچہ ہم ایک مرتبہ گاڑی آنے سے کئی گھنٹے قبل مع بوریا بستر اسٹیشن پر اس طرح آ کر براجمان ہو گئے کہ جیسے ہم سفر کے لئے نہیں سیتہ گرہ کے لئے آئے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ ہم سیتہ گرہ کے لئے آئے تھے اور نہ گاڑی لیٹ تھی، بلکہ بیگم کے بقول ہم اس غیر معمولی احتیاط کا شکار تھے۔ جسے ہمارے ماہر نفسیات دوست

سفر نو بیا" اور عام لوگ ہڑ بڑاہٹ کہتے ہیں۔ اس کا مارا ہوا نہ تو گھر پر چین سے بیٹھ سکتا ہے اور نہ پلیٹ فارم پر۔ گھر پر ہوگا تو وہ پلیٹ فارم پر پہنچنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہے گا اور پلیٹ فارم پر ہوگا تو ٹرین کی آمد آمد کے دغدغے سے اٹھا بیٹھی کیا کرے گا۔

ہماری ٹرین آنے میں کافی کیا کافی سے زیادہ دیر تھی۔ لیکن دوسری ٹرینوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی قیامت کا سا عالم تھا۔ نفسی نفسی پڑی تھی، کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ قلی بھاری بھاری بستر سروں پر لادے ٹرین کی طرف اس طرح جا رہے تھے۔ جیسے گنا ہگار گناہوں کا بوجھ لادے میدان حشر کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ بعض مسافر ابتاب قلی کے نہ آنے سے بے تحاشا چیخ رہے تھے کبھی خود بستر اٹھانے کی کوشش کرتے اور کبھی آتے ہوئے قلی کو بے تابی سے دیکھتے، بعض اپنے بستر بغل میں دبائے بیٹے کو گھسیٹتے اور بیوی کو ڈانٹتے ہوئے گاڑی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ پیچھے رہ جانے والی شریمتی کو اس طرح دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں کہ جیون کی انتم (آخری) یاترا میں ساتھ نہ چھوڑ دو! دوسری طرف شریمتی خوانچے والوں سے ٹکراتی، قلیوں سے بچتی اور مسافروں سے کتراتی ہوئی اپنے اُن گم شدہ پتی دیو کی تلاش میں تن بدن کی سدھ بدھ کے بغیر بدحواس چلی آ رہی تھیں۔ جو گاڑی کی محبت میں گھر والی کو پیچھے چھوڑ کر ڈبے میں گھسنے کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے اور سامنے والے اس ڈبے میں جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس پر اُن سے پہلے درجنوں مسافر سر سے کفن باندھے چڑھائی کئے ہوئے تھے۔ لیکن اندر والے مسافر قلعہ بند ہو کر دھاوا بولنے والے مسافروں کا سخت مقابلہ کر رہے تھے۔ دست بدست ملکہ کہیں کہیں مکا بہ مکا لڑائی جاری تھی لیکن کوئی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا، نہ

چڑھائی کرنے والے مسافر پیچھے قدم ہٹا رہے تھے ورنہ قلعہ بند مسافر کھڑکی کھولتے ہی کچھ کہنے آمادہ تھے

گاڑی پر چڑھنے کے لئے مسافروں میں یہ گھمسان کا رن دیکھ کر دل ہلا جا رہا تھا ہماری ٹرین کا اگرچہ دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لیکن اس کی گڑگڑاہٹ ابھی سے کانوں میں گونج رہی تھی اور ہمیں اپنا حشر، قیامت آثار گاڑی کی آمد سے پہلے ہی نظر آرہا تھا۔

اس لئے ہم محض ذہن کو دوسری طرف لگانے کی غرض سے سامان ساتھ والے لڑکے کے سپرد کر کے میدان حشر یعنی پلیٹ فارم کا منظر دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مصیبت خود اتنی خوفناک نہیں ہوتی جتنا اس کے آنے کا تصور۔ چنانچہ ہم مصیبت سے نہیں محض مصیبت کے آنے کے تصور سے ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ مصیبت کی آمد آمد کی گھڑیاں کاٹنا اتنا ہی دشوار ہوتا ہے جتنا تنخواہ کے لئے پہلی تاریخ کا انتظار۔ غم روزگار کے جھمیلوں کی وجہ سے انتظار یار کی گھڑیاں کاٹنے کا موقع ہی نہ ملا لیکن شاعروں کی زبانی جو سنا ہے اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ریل کے انتظار میں بے چینی بالکل وہی ہوتی ہے جو انتظار یار میں۔ جس طرح انتظار یار میں ہر وقت آہٹ پر کان در پر نظر رہتی ہے اسی طرح ریل کے انتظار میں بھی ہر آن سیٹی پر کان اور سگنل پر نظر کا رہنا ضروری ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ریل کے انتظار کی بے چینی بے لذت ہوتی ہے اور انتظار یار کی بے چینی میں لذت کی چاشنی شامل ہوتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود آجکل ریل کا انتظار کرنے والوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہے اور انتظار یار کرنے والوں کی تعداد اسی رفتار سے کم ہوتی جاتی ہے۔ "ریل اینڈ لو ٹریفک" کے ماہروں کا خیال ہے کہ ریل ٹریفک میں اتنی زیادتی اس لئے ہو رہی ہے کہ لوگ اب محبت بھی گھر کے بجائے پلیٹ فارم پر کرنا پسند کرتے ہیں اور چارپائی

پرلیٹ کر انتظار کرنے کے بجائے اسکوٹر پہ بیٹھ کر۔

تری موٹر کے پیچھے مرا اسکوٹر بھی آتا ہے

گاتے ہوئے محبت کی ریس جیتنے کی کوشش کرتے ہیں اور گھر پر آہیں بھرنے اور بہانے کے بجائے پلیٹ فارم پر سیٹی بجا کر اور رومال ہلا کر محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ اس قیامت کی بھیڑ بھاڑ کے باوجود ایک صاحبزادے شاید اسکوٹر اسٹینڈ کے باہر کھڑا کر کے فرسٹ کلاس کے ایک حسین ڈبے کے پاس اس طرح محو گفتگو تھے جیسے میدان حشر میں مجنوں "العطش العطش" کہنے کے بجائے لیلیٰ سے کھڑا باتیں کر رہا ہو۔

مجھے بے وقت کی راگنی بہت ہی بری لگی کیونکہ اس حشر کے ہنگامے میں مجھے محبت کے بجائے موت کا سایہ ہر طرف نظر آرہا تھا اور میں سہما جا رہا تھا کہ شامت کے مارے ایک اخبار بیچنے والے نے صور اسرافیل کی طرح یہ صدا دی کہ ریل کا زبردست حادثہ کئی ہلاک اور بہت سے زخمی۔ یہ سننا تھا کہ میرا سر چکرانے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ موت کا فرشتہ ریل کے بھیس میں کھڑا سیٹی بجا کر مجھے بلا رہا ہے اور ریل کی طرف بڑھتے ہوئے مسافروں کو دیکھ کر ایسا لگا کہ یہ سب پاگل ہو گئے ہیں اور ریل پر سوار ہونے کے لئے نہیں بلکہ موت کے منہ میں جانے کے لیے دھکے دے بھی رہے ہیں اور کھا بھی رہے ہیں۔ ریل کا یہ حادثہ جس کی اطلاع اخبار بیچنے والا پکار پکار مسافروں کو دے رہا تھا ریل کے پٹری بدل دینے کی بنا پر ہوا تھا۔

پٹری بدلنے کا خیال آتے ہی یہ محسوس ہوا جیسے ہماری ٹرین پٹری بدل جانے کی وجہ سے دوسرے پلیٹ فارم پر سیٹی دے رہی ہے اور ہم بے تحاشا اپنے سامان کی طرف بھاگے اور بدحواسی میں بری طرح ایک صاحب سے ٹکرا گئے جس سے وہ صاحب گرتے گرتے بچے۔ اس وقت ہم اتنی عجلت میں تھے کہ ہمیں "ویری ساری" کہنے کی بھی فرصت نہ تھی لیکن ہم تھوڑی ہی دور بڑھے ہونگے کہ ہم نے دیکھا کہ وہ صاحب لپکے ہوئے ہمارے پیچھے چلے آرہے ہیں اور خاموش چلے ہی نہیں آرہے ہیں بلکہ نام لے لے کر پکار بھی

رہے ہیں۔ اس سے ہم اور بھی گھبرائے اور مڑ کر دیکھنے کے بجائے اور زیادہ تیزی سے قدم بڑھانے لگے ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم جتنی تیزی سے بھاگ رہے ہیں اتنی ہی تیز رفتاری سے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ آخر کار ہم گرتے پڑتے سامان کے قریب پہنچ گئے اور ہم ابھی سامان اٹھانے کے لیے اچھی طرح جھک بھی نہیں پائے تھے کہ ہمیں محسوس ہوا کہ وہی صاحب ہم سے آکر چمٹ گئے اور ہم گھبرا کر انھیں زور سے جھٹکا دینے ہی والے تھے کہ انھوں نے کہا کہ ارے بھئی نسیم سب خیریت تو ہے! اب جو ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے پرانے دوست دبیر ہمیں اپنی باہوں میں دبائے جوشِ محبت میں ہماری ساری پسلیاں نرم کیے دے رہے ہیں اور بے تکلفی سے کہہ رہے ہیں "اتنی بھی کیا جلدی کوئی گاڑی تو چھوٹی نہیں جاتی"۔

میں نے کہا: "خیریت ہوتی تو جان دینے اسٹیشن کیوں آتا۔ گر بھائی تکلف برطرف مجھے اجازت دو میری گاڑی چھوٹی جا رہی ہے مجھے بجنور جانا ضروری ہے۔" انھوں نے حیرت سے کہا "گاڑی بغیر آئے چھوٹی جا رہی ہے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "وہ دیکھو، اگلے والے پلیٹ فارم پر کیا سیٹی دے رہی ہے۔"

انھوں نے جواب دینے کے بجائے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا "بجنور جانے والی گاڑی اب اگلے پلیٹ فارم پر کب سے آنے لگی ہے۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "شاید پٹری بدل جانے سے وہاں پہونچ گئی۔" اس کے بعد میں نے بے تحاشا قلی کو پکارنا شروع کر دیا۔

اب بھائی دبیر خاموش کھڑے تھے اور شاید بیگم کی طرح وہ بھی میرے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میں خدانخواستہ "سفر فوبیا" میں مبتلا ہوں اور مجھ پہ سفر اس وقت بری طرح سوار ہے۔ اتنے میں قلی آ گیا اور وہ سارا سامان جلدی سے سر پر لاد کر اسی طرح کھڑا ہو گیا، جس طرح میں سفر کا بوجھ سر پر لادے کھڑا تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ میں بدحواس تھا اور وہ مطمئن، ابھی میں قلی سے کچھ کہنے بھی نہ پایا

تھا کہ میرے دوست دبیر صاحب نے مسکراتے ہوئے قلی سے باہر جانے والے گیٹ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تیز قدم گیٹ کی طرف چل پڑا۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا۔ "ارے بھئی تم عجیب آدمی ہو، مجھے گھر نہیں بجنور جانا ہے۔"

اس پر دبیر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مجھے بھی بجنور جانا ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "تو باہر کیوں جا رہے ہو۔؟"

انھوں نے سنجیدگی سے کہا تا کہ کھلی ہوا میں آپ کے حواس بجا ہو سکیں۔"

میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ "معاف کیجئے گا کھلی ہوا کی شاید مجھ سے زیادہ آپ کو ضرورت ہے۔"

انھوں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ "جی ہاں" اسی لئے تو باہر جا رہا ہوں۔"

اب میں قابو سے باہر ہو چکا تھا اور میں نے بگڑ کر کہا۔ "تو مجھے کس خوشی میں باہر لئے جا رہے ہیں۔"

وہ میرے غصے سے متاثر ہوئے بغیر بولے "تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ اس وقت کھلی ہوا کی کس کو زیادہ ضرورت ہے۔"

اب ہم لوگ بحث کرتے ہوئے گیٹ کے باہر آ چکے تھے۔ انھوں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ایک بج رہا ہے۔ بجنور جانے والی گاڑی چار گھنٹے لیٹ ہے جناب! چار گھنٹے پہلے گھر سے چل دیئے تھے، اسی لئے جب میں گھر پہونچا تو جناب سے نیاز حاصل نہ ہو سکا لیکن بھابی کے خلوص سے محروم نہ رہا اور ان کے اصرار پر نو بجے ناشتہ اور بارہ بجے کھانا کھا کر بجنور جانے اور آپ کے ساتھ لطف سفر حاصل کرنے کی غرض سے اسٹیشن پہونچا تو معلوم ہوا کہ گاڑی چار پانچ گھنٹے

لیٹ ہے۔ خیال ہوا کہ کہیں آپ اپنی گم شدہ گاڑی کے انتظار میں بے دانہ پانی پلیٹ فارم کو دریا سمجھ کر بستر جمائے پڑے نہ رہیں۔ اس لئے آپ کو گھر واپس لے جانے کے لئے پلیٹ فارم پر تلاش کر رہا تھا کہ خوش قسمتی سے جناب سے ٹکر ہو گئی۔ ورنہ شاید ملاقات بھی نہ ہوتی اور جناب گم شدہ گاڑی کی تلاش میں اگلے پلیٹ فارم پر پہونچ جاتے، جہاں نہ گاڑی ملتی نہ میں۔

تانگہ جوں جوں گھر کے قریب ہوتا جاتا تھا، میری حالت غیر ہوتی جاتی تھی۔ پسینہ چھوٹ رہا تھا اور دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ کاش تانگہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مجھے بیگم کے طعنوں سے بچا لیتا۔ لیکن موت مانگے سے کب آئی ہے! اور اب میرے کانوں میں گاڑی کی گڑگڑاہٹ کے بجائے بیگم، بچوں اور بے تکلف دوست کے مشترکہ قہقہے کی گونج سما رہی تھی اور میں "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ پڑھتا ہوا تانگے سے اس طرح اتر رہا تھا، جیسے جنازہ قبر میں اتارا جا رہا ہو۔ آپ بھی ہاتھ بڑھا کر سہارا دیجئے اور دعائے مغفرت کیجئے تاکہ میں قبر کے عذاب سے نہیں بیگم کے عتاب سے بچ سکوں۔

دروغ تکلّف آمیز

دروغ مصلحت آمیز راستی فتنہ انگیز سے ہمیشہ سے اچھا سمجھا جاتا رہا ہے لیکن مہذب لوگ تکلف میں اور لیڈر لوگ سیاست میں جھوٹ بولنا کچھ برا نہیں سمجھتے سیاست میں جھوٹ فتنہ انگیزی سے بچنے کے لئے نہیں محض مصلحت کے لئے بولا جاتا ہے اور بعض اوقات فتنہ کا باعث بن جاتا ہے۔

سیاست کی طرح عدالت میں بھی جھوٹ بولا اور بلوایا جاتا ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ عدالت میں جھوٹ بھی سچ بولنے کی قسم کھا کر بولا جاتا ہے لیکن سیاست میں اس کا بالکل الٹا ہے۔ یہاں عدالت کے کمرے میں وکیل کے ذریعہ نہیں بلکہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر براہ راست ڈنکے کی چوٹ پر جھوٹ بولا جاتا ہے اور اسے ڈپلومیسی کا مہذب نام دے کر اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے فخر کیا جاتا ہے اور اس میں ایک نیتا دوسرے نیتا سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میدان میں کامیابی کا دارومدار صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنے کا کون کتنا سلیقہ رکھتا ہے۔

یہ تو تھی وکیلوں اور لیڈروں کی بات جو مطلب اور مصلحت کی بنا پر قانون اور ڈپلومیسی کے نام سے جھوٹ بولتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا آپ کا تعلق ہے نہ ہم وکیل ہیں اور نہ لیڈر اس لئے ہم جھوٹ نہ قانون کے نام سے بولتے ہیں اور

اور نہ ڈپلومیسی کے نام سے لیکن تکلف میں جھوٹ بولنا ہم لوگ بھی برائی نہیں بلکہ تہذیب خیال کرتے ہیں۔ بھوکے ہونے کے باوجود کھانے کے لیے پوچھنے پر یہ کہنا برا نہیں سمجھتے کہ بسم اللہ کیجیے، واللہ بالکل خواہش نہیں، پوچھنے والا اگر تکلف میں جھوٹ بولنے کا عادی نہیں تو وہ بچارہ اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ آپ واقعی بھوکے نہیں ہیں اور اصرار کرنے کے بجائے خاموش ہو کر کھانے میں معروف ہو جاتا ہے اور آپ اس کی سادہ لوحی کی داد دینے کے بجائے دل ہی دل میں اس کے گنوار پن پر پیچ و تاب کھانے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کتنا بیوقوف ہے تکلف کے معمولی آداب سے بھی واقف نہیں اور وہ یہ نہیں جانتا کہ مہذب آدمیوں کا معدہ کھانے کے لیے صرف ایک مرتبہ پوچھنے پر گنواروں کی طرح فوراً ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے تیار نہیں ہو جاتا بلکہ جس طرح دیہات کی عورتوں کو کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہونے میں دیر لگتی ہے اسی طرح شہر کے مردوں کے معدے کو کھانے کے لیے تیار کرنے میں کافی اصرار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ اس راز سے واقف نہیں وہ لوگ۔ بالکل خواہش نہیں کا مطلب غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دو تین مرتبہ اصرار کے بعد بھی معدے کا یہی حال رہے گا۔ حالانکہ ایسی بات نہیں۔ مہذب معدہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے اس لیے دو تین بار سے زیادہ انکار وہ برا سمجھتا ہے اور یہ کہہ کر جب آپ مجبور کر رہے ہیں تو آپ کی خاطر سے کھانا ہی پڑے گا، کھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اب اگر آپ خدانخواستہ مہذب معدے کی ان پر تکلف عادات سے ناواقفیت کی بنا پر صرف ایک مرتبہ پوچھ کر خاموش ہو جاتے ہیں تو اس سے آپ نہ صرف یہ کہ اپنے گنوار پن کا ثبوت دیتے ہیں بلکہ مہذب معدے کو بھی نیند سے جگا کر اس کی معصوم بھوک کو بلاوجہ چھیڑنے کا گناہ بھی کرتے ہیں جس کے بعد آپ تو مزے میں پھر

کھانا شروع کر دیتے ہیں لیکن وہ بے چارہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتا ہے اور اور آپ کے تیر نیم کش یعنی ادھوری دعوت کی چوٹ کھا کر اسے کسی پہلو چین نہیں آتا لیکن آپ اپنی بے حسی کی بنا پر اس کے کرب کو محسوس نہیں کرتے اور آپ کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ ایک مرتبہ پھر پوچھ کر اسے موقعہ دیں کہ اس نے آپ کے گنوارپن سے ناواقفیت کی بنا پر جو انکار کیا تھا اس پر نظر ثانی کر سکے۔ کیونکہ تکلف میں جو انکار کیا جاتا ہے وہ حقیقی انکار نہیں ہوتا بلکہ انکار اقرار ہی ہوتا ہے۔

اس لیے آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کبھی آپ کسی سے کھانے کے لئے کہیں تو صرف ایک بار نہ کہیں بلکہ اس کے یہ کہنے کے باوجود کہ بالکل خواہش نہیں، اس وقت تک اصرار کرتے رہیں جب تک اس کا پر تکلف معدہ آپ کی گرمیٔ اخلاق سے جونک نہ پڑے اور کھانے کے لئے تیار ہو جائے۔ آپ کو شاید اس پر تعجب ہو رہا ہو کہ ایک بار بالکل خواہش نہ ہونے کا اعلان کر دینے کے بعد معدہ پھر کھانے کے لیے کیونکر تیار ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ پر تکلف معدہ اور سیاسی لیڈر مزاج کے لحاظ سے بالکل ایک ہوتے ہیں جس طرح سیاسی لیڈر مصلحت کی بنا پر آئے دن پالیسی بدلا کرتے ہیں اسی طرح پر تکلف معدہ اصرار کی بنا پر انکار کو اقرار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سیاست کی طرح تکلف میں بھی دروغ گوئی بری نہیں سمجھی جاتی اور مثل مشہور ہے کہ دروغ گو را حافظہ نہ باشد، چنانچہ پر تکلف معدہ اصرار کے بعد جب کھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کو یہ بالکل یاد نہیں رہتا کہ ابھی چند منٹ پہلے وہ یہ کہہ چکا ہے کہ بالکل خواہش نہیں، اور شاید شروع میں کئے گئے تکلف کی تلافی کے لئے وہ اس بے تکلفی سے کھانا شروع کر دیتا ہے کہ دعوت دینے والے کو تکلف کی شکایت نہیں بے تکلفی کا شکوہ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ تھا وہ جھوٹ جو تکلف میں بولا جاتا ہے اب اس جھوٹ کا نمونہ ملاحظہ

فرمایئے جو تکلف میں نہیں تجارت میں برلا جاتا ہے۔

ایک دن ہم دفتر جا رہے تھے ہم نے دور سے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر ایک صاحب سوٹ بوٹ سے لیس گلا پھاڑ پھاڑ کر تقریر کر رہے ہیں پہلے ہم سمجھے کہ یہ کوئی کامریڈ ہیں جو اسٹریٹ کارنر میٹنگ کر رہے ہیں لیکن جوں جوں قریب ہوتے گئے آنکھ کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا گیا اس لئے کہ وہ امراض چشم کے علاوہ دیگر عام امراض اور خاص طور پر مخصوص امراض کی دوائیں مع ترکیب استعمال علی الاعلان فروخت کر رہے تھے۔

ہم نہ عام امراض میں مبتلا تھے نہ مخصوص میں لیکن ہم ان دوا فروشوں کے زور بیان کے بڑے قائل ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ دن رات گلی کوچوں میں دوا فروشی میں اپنا سر کھپانے کے بجائے کہیں سے کچھ روپیوں کا انتظام کر کے الکشن میں کھڑے ہو جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ یہ اپنے زور بیان سے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیں اور الکشن جیتنے کے بعد اسمبلی پہونچ کر ایوان میں اپنی دھواں دھار تقریر سے ایسی دھوم مچا دیں کہ کوئی تعجب نہیں کہ کوئی پارٹی انھیں ہونہار سمجھ کر گود لے لے اور اپنا پارٹی لیڈر بنا لے۔

ہمیں ان لوگوں کی سحر انگیز خطابت دیکھ کر اس پر حیرت ہوتی ہے کہ سیاسی پارٹیاں الکشن کے موقع پر ان کی خدمات سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتیں یوں تو ہمارے یہاں کرائے کے مقررین کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن فن خطابت کی جو دلربائیاں ان میں پائی جاتی ہیں وہ بھلا اس قسم کے الکشنی مقرروں میں کہاں مل سکتی ہیں لیکن شاید یہ اتنی کم قیمت پر دوا فروشی چھوڑ کر ضمیر فروشی پر آمادہ نہ ہوں۔

جب ہم قریب پہونچے تو وہ ترکیب استعمال کی تفصیلات کے بعد دوا کی شرح قیمت بتا رہے تھے کہ یوں تو یہ لاجواب دوا انمول ہے لیکن نمونے کے لئے فی شیشی صرف

ایک روپیہ چار آنے قیمت رکھی گئی ہے اس وقت دوا زیادہ نہیں ہے اس لئے نمونے کی ایک شیشی کے علاوہ زیادہ نہیں مل سکتی ۔

حالانکہ اس سے قبل وہ ایک مرتبہ تجربے کے لئے مفت دوا تقسیم کرنے کا وعدہ کر چکے تھے لیکن لیڈروں کی طرح وہ بھی عوام کے حافظہ کی کمزوری پر بھروسہ کرکے اپنا وعدہ بھول چکے تھے اور بار بار قیمت کا اعلان کر رہے تھے ۔

جن لوگوں کو ان کا وعدہ یاد تھا وہ شاید وعدہ خلافی سے خفا ہو کر کھسلے جا رہے تھے اور جن کا حافظہ کمزور تھا وہ دوا خرید کر اسے مضبوط بنانے کے لئے جیب سے پیسے نکال رہے تھے اور جو قیمت ادا کر چکے تھے وہ شیشی ہاتھ میں لئے کھڑے تھے تاکہ ترکیب استعمال ایک مرتبہ اور معلوم کرلیں کیونکہ وہ بتا چکے تھے کہ دوا کافی طاقتور ہے اور اس کی ایک خوراک بوڑھے کو جوان بنا سکتی ہے ۔

نمونہ کی دوا مفت نہیں رعایتی قیمت پر تقسیم کرنے اور پیسے جمع کرنے کے بعد دوا فروش صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا جو صاحب ترکیب استعمال بھول گئے ہوں وہ ایک مرتبہ پھر پوچھ سکتے ہیں کیونکہ استعمال میں ذرا سے ہیر پھیر میں سخت نقصان پہونچ سکتا ہے ۔

اسکے بعد انھوں نے مسکرا کر کہا ۔ " آپ کو یقین نہ آئے گا لیکن سننے میں کیا ہرج ؟ جب میں نے سالہا سال ہمالیہ کی چوٹیوں کا گشت لگا کر جڑی بوٹیوں سے یہ شباب آور دوا تیار کی تو اس وقت میرے دادا جان کی عمر سو سے کچھ اونچی ہو چکی تھی ، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت زندہ درگور یعنی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے لیکن زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے اس لئے جینے کی ہوس اب بھی باقی تھی انھوں نے جوں ہی سن گن پائی کہ میں نے ایک ایسی دوا ایجاد کی ہے کہ بوڑھے کو جوان بنا سکتی ہے تو ایک رات انھوں نے اٹھ کر چپکے سے

سے ایک ساتھ تین خوراکیں حلق کے نیچے اتارلیں صبح جب ان کی پوتی چائے لے کر باہری کمرے میں گئی تو دیکھا دادا جان چارپائی سے غائب ہیں اور دروازے کھلے ہیں۔ چق اٹھا کر باہر دیکھا تو دادا جان گلی میں لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔

اس کے بعد وہ بیگ ہاتھ میں لے کر کھیل ختم پیسہ ہضم کہتے ہوئے رکشے پر روانہ ہو گئے اور خریدار دوا کی کرامات سن کر دیر تک سہمے کھڑے رہے۔

پہلے آپ

بوڑھے نواب صاحب نے حیرت سے اس نوجوان کو دیکھا جو بس پر چڑھنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا لیکن انھیں بڑھتے دیکھ کر رک گیا اور ادب سے کہا پہلے آپ!

نواب صاحب پہلے آپ! کا جملہ سن کر اس طرح چونک پڑے جیسے پردیس میں کسی پرانے جان پہچان کو دیکھ کر آدمی چونک پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ جملہ انھوں نے عرصہ سے نہ سنا تھا۔

نواب صاحب کے منہ پر صاحبزادے پہلے آپ کا جملہ آتے آتے اٹک کر رہ گیا شاید جذبات کے امنڈ آنے سے گلا رندھ گیا تھا۔ انھوں نے تکلفاً پہلے آپ! کہنے کے بجائے محبت سے نوجوان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا بیٹے کہاں رہتے ہو؟ اور یہ کہتے ہوئے وہ عجلت میں بس پر چڑھ گئے۔ کیونکہ بس پہلے آپ! کہے بغیر آگے بڑھ رہی تھی اور لائن میں پیچھے کھڑے مسافر بے مروت بس کو اس بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ جس بے بسی سے سفید انگرکھے اور چوڑی دار پاجامے والی پرانی تہذیب چست پتلون اور اونچی ٹی شرٹ والی تہذیب کو دیکھ رہی ہے۔

نواب صاحب کے بعد نوجوان بھی بس پر چڑھ گیا اور بس مسافروں کے سیٹ پر بیٹھنے کا انتظار کئے بغیر چل دی اور مسافر ڈگمگا کر ایک دوسرے پر اس طرح گرنے لگے جیسے کہ زلزلہ آ گیا ہو۔ بس میں بیٹھنے کی گنجائش تو کیا بقول شخصے تل رکھنے کی

بھی جگہ نہ تھی۔ مسافر لائن لگائے آگے پیچھے اس طرح کھڑے تھے کہ بس پر راشن کی دوکان کا شبہ ہوتا تھا۔ بیچارے نواب صاحب بھی راڈ میں لٹکے ہوئے چمڑے کو اپنے ہاتھ سے مضبوط پکڑے اور چھڑی کا سہارا لیے کھڑے تھے۔ لیکن بس کے جھٹکے انھیں بار بار اس طرح ہلا دیتے، جس طرح صنعتی دور کی دوڑ دھوپ اور مقابلے والی زندگی پرانی تہذیب کی عمارت کو ہلائے دے رہی تھی اور بس میں کھڑے ہوئے مسافر، خالی ہونے والی سیٹ کے لیے پہلے آپ! کہنے کے بجائے خود پہلے بیٹھنے کے لیے باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔

بوڑھے نواب صاحب کا ہاتھ تسمہ پکڑے پکڑے سن اور پاؤں کھڑے کھڑے شل ہو گئے تھے۔ مسافر اتر بھی رہے تھے اور چڑھ بھی رہے تھے سیٹیں خالی بھی ہو رہی تھیں اور بھر بھی رہی تھیں خالی ہونے والی جگہ کے لیے کئی کئی مسافر ایک ساتھ اس طرح جھپٹتے جس طرح پھینکی جانے والی ہڈی کے لیے کتے جھپٹتے ہیں۔ بس بڑی ڈال کر کتے لڑائی اور لکھنؤ کی پرانی تہذیب کے سینے کو بیدردی سے روندتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ کئی اسٹاپ آئے۔ کچھ مسافر چڑھے اور بہت سے اترے اور اب کھڑے رہ جانے والے مسافروں میں صرف اگر کھے والے بوڑھے نواب صاحب اور پہلے آپ! کہنے والا نوجوان رہ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ دونوں پہلے ہم کی بجائے پہلے آپ! کہنے کے قائل تھے۔

نواب صاحب تھک کر چور ہو گئے تھے پاؤں ڈگمگا رہے تھے اور ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔ اور قریب تھا کہ دونوں ایک ساتھ جواب دے دیں کہ اتفاق سے نواب صاحب کے بالکل قریب آرام سے بیٹھے ہوئے ایک صاحب جو اب تک اونگھ رہے تھے جھٹکے کے ساتھ بس کے رکتے ہی گڑبڑا

کراتے کھڑے ہوئے اور جگہ خالی ہو گئی نواب صاحب کا ہاتھ بے اختیار تسمے سے چھوٹ گیا اور وہ بیٹھنے کے لیے جھکنے لگے۔ لیکن جھجک کر پھر سنبھل گئے۔ شاید لکھنؤ کی پرانی تہذیب نے پیچھے سے ان کا دامن تھام لیا تھا اور انھوں نے مڑ کر کھڑے ہوئے نوجوان کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہ کہہ رہے ہوں پہلے آپ! نوجوان نے لپک کر لڑکھڑاتے ہوئے نواب صاحب کو سنبھال لیا اور پہلے آپ! کہہ کر سیٹ پر بٹھا دیا۔

نواب صاحب بچپن میں بھی کبھی اسکول میں کھڑے نہ کرائے گئے تھے۔ اب بڑھاپے میں بس پر گھنٹوں کھڑے رہنے کی وجہ سے پسینے پسینے ہو گئے تھے۔ ململ کا کرتا تر بتر تھا اور بغلوں کے پاس انگرکھے کے اندر سے پسینہ اس طرح جھانک رہا تھا۔ جیسے کہ وہ قریب کھڑے ہوئے اجنبی نوجوان کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ کیونکہ اجنبی ہونے کے باوجود اس میں اپنائیت کی بو پائی جاتی تھی۔ وہ پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا اور نواب صاحب سے پوچھ رہا تھا کہ کہاں تشریف لے جائے گا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ پہلے نہ اتر جائے اور نواب صاحب کو بس کی اس بے رحم بھیڑ میں تنہا نہ چھوڑ دے۔ جو نواب صاحب کو پہلے آپ کہہ کر سہارے سے اتارنے کے بجائے عجلت میں دھکا دے کر نیچے گرا دے۔

نواب صاحب نے کہا کہ مجھے جانا تو آگے ہے۔ لیکن میں گول دروازے اتر دوں گا یہ سن کر نوجوان کو اطمینان ہو گیا۔ کیونکہ بس وہیں کھڑی ہو جاتی ہے اس لیے مسافر اطمینان سے اترتے ہیں۔

اب نواب صاحب کی باری تھی اور انھوں نے بڑی شفقت سے پوچھا کہ بیٹا تم کہاں جاؤ گے؟۔

میں گول دروازے تو نہیں جاؤں گا لیکن اسی کے قریب ہی کالج والے

چوراہے پر اترجاؤں گا۔ نوجوان نے جواب دیا۔

ہوا لگنے سے اب پسینہ کچھ خشک ہو چلا تھا اور نواب صاحب کے حواس بجا ہو گئے تھے انھوں نے پہلے ہم ۱ والے زمانے میں پہلے آپ ! کہنے والے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ وہ انگرکھا تو نہیں پہنے تھا۔ لیکن انگرکھے کی طرح ڈھیلا ڈھالا اور ویسے ہی صاف شفاف کوٹ پہنے تھا۔ اور ہاتھ میں چھڑی کے بجائے ڈاکٹروں والا آلہ لیے ہوئے تھا نواب صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے انگرکھا پرانی اعلا قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے نئے زمانے میں نیا جنم لے کر کھڑا ہے خوشی سے ان کی بوڑھی آنکھیں چمک اٹھیں اور انھوں نے محبت سے کہا کہ "بیٹا ! شاید تم ڈاکٹری پڑھتے ہو۔ تم سے مل کر مجھے دلی راحت ملی تم ہماری پرانی تہذیب کی اعلا قدروں کے "نئے رکھوالے ہو۔"

نوجوان نے چونک کر کہا یہ کیسے ؟

" اس لیے کہ میں عرصہ سے قریب روزانہ علاج کے سلسلے میں بس سے آتا جاتا ہوں لیکن یہ پہلا موقعہ ہے کہ بس کی بھیڑ میں کسی مسافر نے اترتے یا چڑھتے وقت کسی سے یہ کہا ہو کہ پہلے آپ !"

نوجوان نے کہا کہ نواب صاحب ! میرا خیال ہے کہ پرانی اور نئی تہذیب میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف جذبہ کا ہے۔ کیوں کہ پہلے آپ ! رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ اصل چیز اس کے پیچھے چھپا ہوا جذبہ ہے پہلے آپ ! اگر کسی بزرگ، بچے، یا بیمار سے بطور ہمدردی کے، جذبہ ایثار کے ماتحت خادمں سے کہا جائے تو وہ راحت اور رحمت ہے۔ لیکن اگر صرف رسماً اور تکلفاً ظاہر داری کے جذبے سے کہا جائے تو بعض وقت مصیبت اور زحمت کا باعث بن جاتا ہے۔ آپ تو بزرگ آدمی ہیں۔ آپ نے پہلے آپ !

کی کرشمہ سازیوں کے نہیں معلوم کتنے قصے دیکھے اور سنے ہوں گے۔"

نواب صاحب نے ہنس کر کہا بیٹے! صرف دیکھے اور سنے ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر بیتے بھی ہیں، تم سچ کہتے ہو کہ بعض لوگ پہلے آپ! تہذیب میں نہیں بلکہ تکیہ کلام کے طور پر موقعے اور بے موقعے کسی جذبے کے بغیر کہتے رہتے ہیں۔ وقت کم ہے ورنہ بیسیوں قصے سنا سکتا تھا۔ اچھا! اپنے گھر ہی کا ایک آنکھوں دیکھا قصہ سنائے دیتا ہوں۔

سردی کا موسم تھا کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے۔ لحاف سے ہاتھ نکالتے ڈر لگتا تھا گھر کے سب لوگ کمرے کے اندر انگیٹھی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ مسہری کے پاس اسٹول پر انگیٹھی میں چائے کے لیے پانی چڑھا تھا۔ مسہری پر بیگم اور بچیاں سکڑی ہوئی بیٹھی تھیں اور برابر والے تخت پر بیگم کے چھوٹے بھائی لحاف میں لپٹے ملیندہ بنے براجمان تھے۔ انھیں کے پاس میں بیٹھا تھا۔ میرے اغل بغل شدن اور چھبتن میرے دونوں چھوٹے لڑکے اپنی اپنی رضائی اوڑھے نہیں بلکہ یوں ہی ہم لوگوں کی خاطر سے گلوں میں لپیٹے ہوئے اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب موقع ملے اور کب یہ رضائی دلائی پھینک پھانک کمرے کے باہر کلیلیں کرتے پھریں۔ وہ موقعہ پاکر ایک دوسرے کے ساتھ شرارت بھی کرتے جا رہے تھے۔

بیگم کو بچوں کی شرارتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ لڑکے بڈھوں کی طرح سردی میں سانس روکے دبکے لحاف میں پڑے رہیں وہ لڑکوں کو بڈھوں کے سامنے شرارت کرتے دیکھ کر آگ بگولا ہو گئیں اور آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً مارنے کے لیے مسہری پر سے جھپٹیں اور اپنے دوپٹے کی لپیٹ میں انگیٹھی پر رکھی چائے کی ابلتی کیتلی ساتھ لیتی آئیں۔ بیگم کا رخ بچوں کی طرف اور کیتلی کا رخ بچوں کے ماموں کی طرف تھا۔ جو یا تو اونگھ رہے تھے یا مراقبہ میں تھے۔ میرے منہ سے

بے اختیار نکلا ارے محمود میاں! چاء ۔ اس پر وہ چونک کر بھاگنے کے بجائے نہایت ادب سے بولے بھائی صاحب پہلے آپ! بیگم اپنے بھائی کے اس تکیہ کلام سے عاجز تھیں اب اس خطرناک موقع پر ان کا بے موقع پہلے آپ! سن کر وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ اور بچوں پر بگڑنے کے بجائے بھائی پر غصہ ہونے لگیں اور کہنے لگیں بھاڑ میں جائے تمہارا پہلے آپ!۔ اٹھو! نہیں جل کر بھسم ہو جاؤ گے۔ اس پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے دیکھا کہ کیتلی کے ساتھ انگیٹھی کا جلتا ہوا ایک کوئلہ بھی محمود میاں کے لحاف سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا محمود میاں! بھاگو لحاف پر آگ! اس پر ان کے کہنے سے پہلے ہی لڑکے بول اٹھے پہلے آپ! بچوں کے اس بر وقت مذاق پر بیگم کو بھی ضبط نہ رہا اور بچوں کی پٹائی کرنے کے بجائے ہنستے ہوئے بھائی کا لحاف کھینچنے لگیں جو پہلے آپ! کہنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

بس کی رفتار سست ہو رہی تھی نواب صاحب نے چونک کر بس کے باہر دیکھا لیکن نوجوانوں نے اطمینان دلایا کہ ابھی درمیان میں کئی اسٹاپ اور باقی ہیں۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا کہ پہلے آپ! کے کچھ سچے اور کچھ من گھڑت قصے اتنے ہیں کہ نہ مجھ میں سنانے کا دم ہے۔ اور نہ تمہیں سننے کی فرصت! اگر بس اسٹینڈ آنے میں دیر ہو تو وہ لطیفہ سنا دوں جو اللہ بخشے ہمارے محلے کے ایک لطیفہ ساز پہلے آپ! کے متعلق سنایا کرتے تھے۔ اس پر نوجوان نے کہا ابھی کافی دیر ہے ضرور سنائیے۔

نواب صاحب نے کہا کہ وہ کہتے تھے کہ ان کے پڑوس میں ایک بزرگ رہتے تھے وہ پہلے آپ! کے اتنے عادی تھے کہ کوئی کام بھی وہ بسم اللہ کی طرح پہلے آپ! کہے بغیر کر ہی نہ سکتے تھے۔ اللہ کی کرنی کہ وہ ایک مرتبہ بیمار پڑے

اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی حالت غیر ہو گئی، گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ نبضیں دیکھی جانے لگیں کوئی طلبہ بازسرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین بھی پڑھنے لگا۔ سورۂ یٰسین سنتے ہی وہ چونک پڑے اور دھیمی آواز میں کہا کہ بھئی! گھبراؤ نہیں میں ایسا بیمار نہیں ہوں کہ ڈاکٹر بلانے کے بجائے سورۂ یٰسین پڑھی جانے لگے۔

اس پر لوگوں کو اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا اور فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر بھی لکھنؤ ہی کا تھا۔ اس نے آتے ہی جھک کر آداب کیا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ بڑے صاحب! گستاخی معاف آپ مجھے بیمار تو معلوم نہیں ہوتے اگر ملاقات ہی منظور تھی، تو یونہی بلا لیا ہوتا میں زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا۔ خیر احتیاطاً ٹمپریچر دیکھے لیتا ہوں ویسے آپ کیا آپ کے دشمن بھی بیمار نظر نہیں آتے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے نہایت ادب سے اُن کے منہ کی طرف تھرمامیٹر اس طرح بڑھایا جیسے گلوری بڑھا رہا ہو۔ ہاتھ کا بڑھانا تھا کہ نقاہت کے باوجود بڑے میاں کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔ اجی حضرت! پہلے آپ!۔

یہ سن کر ڈاکٹر پہلے تو کچھ چکرایا کہ تھرمامیٹر بیمار کے منہ کے بجائے اپنے منہ میں کیسے لگالے لیکن وہ پہلے آپ! کے آداب سے ناآشنا نہ تھا اس لیے وہ نیم استادہ ہو کر کورنش بجالایا اور کہا اجی حضور! یہ کیسے ہوسکتا ہے پہلے آپ! اور یہ کہتے ہی اس نے لُقمے کی طرح تھرمامیٹر بڑے میاں کے منہ میں رکھ دیا۔ لیکن پوپلے منہ سے پہلے آپ! کی آواز کے ساتھ تھرمامیٹر بھی باہر نکل کر فرش پر گرا اور ٹوٹ گیا۔ تھرمامیٹر کا ٹوٹنا شاید شگون نیک ثابت ہوا اور بڑے میاں لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو گئے۔

اس کے بعد بس رکی اور نوجوان اترنے کے لیے کھڑا ہونے لگا۔ اس پر نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا پہلے آپ! اور نوجوان خدا حافظ کہتا ہوا بس سے اتر گیا۔

بھینس بڑی یا عقل؟

مرزا۔ "معاف کیجئے گا آج میں آپ سے ایک بے تکا سوال کرنا چاہتا ہوں"
میں۔ "فرمایئے! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے بے تکے سوالات سننے اور بے تکے جوابات دینے کی اچھی خاصی مشق ہے۔ صحافت میں آنے سے پہلے میں نے وکالت کا بھی کچھ دن مزہ چکھا ہے اور جرح میں بے تکے سوالات سنے اور بحث میں بے تکے جوابات دیئے ہیں۔ اس لئے آپ جس قدر بے تکا سوال کرنا چاہیں بلا تکلف کر سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو بھی بلا کسی تکلیف کے اسی قدر بے تکا جواب سننے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"
مرزا۔ "شرط قبول! سوال سنیئے جواب دیجئے! آپ کے نزدیک بھینس بڑی ہے یا عقل؟"
میں۔ "میرے نزدیک۔ نہ بھینس بڑی ہے نہ عقل! بلکہ سب سے بڑی دولت ہے۔ اگر آپ کے پاس دولت ہے تو آپ بھینس اور عقل دونوں کو اپنے گھر کے سامنے کھونٹے میں باندھ کر عقل اور بھینس ہی سے نہیں دنیا بھر سے اپنی دولت کی بڑائی تسلیم کرا سکتے ہیں لیکن اگر آپ کے پاس دولت نہیں بلکہ صرف عقل یا بھینس ہے تو آپ عقل کی باتیں کر کے اپنے آپ کو لکو یا بھینس پال کر اپنے بدھو کہلا سکتے ہیں لیکن نہ بڑے آدمی بن سکتے ہیں نہ بڑے لیڈر۔ ہاں اگر آپ کے پاس اتفاق سے بھینس اور عقل دونوں ہیں تو آپ دودھ کے نام سے پانی بیچ کر بڑے آدمی

بن سکتے ہیں اور بڑا آدمی بننے کے بعد بڑا لیڈر بننا اتنا ہی آسان ہے جتنا بھینس بیچ کر کار خرید لینا لیکن عقل اور بھینس کا ایک جگہ جمع ہونا بہت دشوار ہے کیونکہ عقل اور بھینس دونوں اپنے کو بڑا سمجھتی ہیں اور آپ جانتے ہیں دنیا کے دو بڑے ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے چاہے ساری دنیا ایٹم بم کی آگ سے جل کر راکھ ہو جائے۔ اس لیے صبر کیجیے اور یقین رکھیے کہ ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ بڑائی کا بھوت بڑوں کے سر سے اتر جائے گا اور پھر عقل اور بھینس ایک ساتھ جمع ہوسکیں گی۔

مرزا۔ "قطع کلام معاف! میں نے بے تکے جواب سننے کا وعدہ کیا تھا لیکن بے موقع وعظ سننے کا اقرار نہیں کیا تھا کیونکہ حضرتِ واعظ کی بات کا بھروسہ مجھے اس وقت سے نہیں رہا جب سے میں نے خلوت میں انھیں کارِ دیگر میں مشغول رہنے کی خبر معتبر ذرائع سے سنی ہے۔"

میں۔ "خبر تو آپ نے صحیح سنی ہے لیکن آپ کے خبر رساں کی پہنچ معلوم ہوتا ہے کہ محض واعظ کی خلوت تک ہے ورنہ اونچی خلوتوں میں کارِ دیگر کے وہ جلوے نظر آتے ہیں کہ بچارے واعظ کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہوں گے۔ اور اگر آپ کسی طرح یہ جلوے بھینس اور عقل کو دکھا سکیں تو یقین ہے کہ دونوں بڑائی کا دعویٰ ترک کر کے جنگل کی راہ لیں۔ لیکن بڑے لوگوں میں بھینس کی پہنچ ہے نہ عقل کی۔"

مرزا۔ "تو پھر یہ بے عقلے بڑے آدمی کیسے ہو گئے؟"

میں۔ "یہ نہ پوچھیے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میں نے بھینس سے زیادہ موٹی عقل رکھنے والے ایسے بڑے آدمی دیکھے ہیں جن کی عقل کا لوہا ہم آپ ہی نہیں بڑے بڑے دانشور مانتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدہ لکھ کر سناتے ہیں۔ اور جب

ان عقل والوں کی حماقت پر ضمیر ڈنڈا لے کر دوڑ آتا ہے تو وہ بھی سوال دہرانے ہیں کہ بھینس بڑی کہ عقل۔ اس کے بعد عقل و دولت کی بھاری بھرکم بھینس دیکھ کر اس طرح شرما جاتی ہے جس طرح سمجھ دار سیکریٹری اپنے گماشتہ سیٹھ کی ڈانٹ سن کر کھسیا جاتا ہے پھر اس پر اس راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ عقل پر پتھر صرف اس لیے پڑے تھے کہ عقل والوں نے جان بوجھ کر عقل کے بجائے بھینس کی بڑائی مان لینے کا گناہ عظیم کیا تھا۔

مرزا۔ مگر جناب! یہ کیسی دھاندھلی کہ گناہ تو عقل والوں نے کیا اور پتھر پڑے بیچاری بے زبان عقل پر؟

میں۔ جی ہاں! اس جگ کی یہی ریت ہے کہ بے زبان مارا اور زبان والا کاندھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اسی لیے سمجھ دار لوگ بولنے والے دھوبی کے بجائے بے زبان گدھے کے کان پکڑنا بہتر خیال کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اگر آپ کو کبھی اپنے دھوبی سے کپڑے کھونے بدلنے، میلے دھونے، دھبے ڈالنے، خود پہننے اور آپ کو ترسانے اور دیر میں لانے کی شکایت ہو تو آپ کبھی بھولے سے بھی اپنے دھوبی کے منہ نہ لگئے کیونکہ میرا اور شاید آپ کا بھی تجربہ ہو کہ جو دھوبی کپڑے لانے میں جتنا سست ہوتا ہے اتنا ہی زبان کا تیز طرار ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے منہ لگنا ٹھیک نہیں کیونکہ وہ لڑنے کے علاوہ کپڑے دھونا بھی بند کر دے گا۔ اور میں جانتا ہوں کہ آپ واشنگ کمپنی میں ارجنٹ اور بھی ارجنٹ کی شرح پر کپڑے دھلانے کی استطاعت نہیں رکھتے اور شہر کی واشنگ کمپنیوں نے قسم کھائی ہے کہ وہ آرڈینری کپڑے دھو کر اپنی ساکھ خراب نہ کرینگی۔ دنیا کی نظروں میں نہ آرڈینری آدمی آدمی ہوتا ہے اور نہ آرڈینری کپڑا لباس۔ اسی لیے شہر کے نوجوان سیدھا سادا آدمی بننے کے بجائے ٹیلر میڈ جنٹلمین بننا زیادہ پسند

کرتے ہیں۔

مرزا۔" جناب! یہ ٹیلرمیڈ جنٹلمین "اسٹیمین کی طرح کا کوئی اخبار ہے ؟"

میں۔ " جی نہیں یہ کوئی اخبار نہیں بلکہ یہ وہ فیشن ایبل نوجوان ہیں جو اپنے کو شریف آدمی ظاہر کرنے کے لیے کردار سے زیادہ خیاط (درزی) پر بھروسہ کرتے ہیں اور سادہ زندگی اور اونچے خیالات کے بجائے ٹھاٹھ کی زندگی اور گھٹیا خیالات کی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی دن ذرا آنکھ بند کرکے اُن سے بات چیت کیجیے تاکہ آپ ان کپڑوں سے متاثر ہوئے بغیر اُن کے متعلق رائے قائم کرسکیں۔ میں شرط بند کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر آنکھیں بند ہونے کے باوجود وہ آپ کو ننگے نظر نہ آئیں تو جو چور کی سزا وہ میری!"

مرزا۔" خیر شرط تو میں نے مان لی لیکن یہ بتائیے کہ آج کل چور کو سزا ملتی کہاں ہے! اب چور جیل میں چکی پیسنے کے بجائے۔ سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا گیت گاتے، موجیں کرتے پھر رہے ہیں۔"

میں۔" تو پھر صبر کیجیے اور اس دن کا انتظار کیجیے۔ جب چور کو توال کو ڈانٹنے کے بجائے کوتوال چور کو ڈانٹنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوجائے۔"

مرزا۔" مگر شاید اس وقت تک آپ میری پہنچ سے باہر ہو چکے ہوں گے۔"

میں۔" آپ کا مطلب یہ ہے کہ قوم کا لیڈر ہو چکا ہوں گا۔"

مرزا۔" جی نہیں! قوم کے پیارے نہ ہوسکنے کی بنا پر اللہ کے پیارے ہوچکے ہوں گے اور میری دست رس سے دور موت کی گود میں میٹھی نیند سو رہے ہوں گے۔"

میں۔" خیر جہاں تک مرنے کا تعلق ہے وہ برحق ہے لیکن مرنے کے بعد بھی میٹھی نیند سونا مشتبہ کیونکہ اللہ بخشے بعض آنجہانی شاعروں نے مرنے کے بعد بھی

چین نہ پاسکنے کی شکایت لکھ کر بھی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تحریر پر کراماً کاتبین کی تصدیق نہیں ہے جو وہاں کے سرکاری ریکارڈ کیپر ہیں۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کو یقین نہیں آتا اور وہ بیچارے دُنیا میں حور سے منہ موڑے وعدۂ حور پر آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ آج کل کی تجارتی دنیا میں تیرہ اُدھار کے بجائے نو نقد اچھے خیال کیے جاتے ہیں اسی لیے سمجھدار لیڈر اپنی خدمات کی قیمت جنت میں جمع کرنے کے بجائے دنیا ہی میں نقد وصول کرنے کے لیے کیسے کیسے چوتے بدلا کرتے ہیں اور زبانِ حال سے یہ صدا لگاتے رہتے ہیں ؎

کوئی منصب دلا کوئی عہدہ دلا
ہوگا تیرا بھلا۔"

مرزا۔ "معاف فرمایئے گا کبھی آپ سرکاری ترجمان تو نہیں رہ چکے ہیں؟"

میں۔ "نصیب دشمناں یہ خیالِ بد آپ کے ذہن مبارک کو کیونکر لاحق ہوا بھلا بتایئے جب میں زندگی میں اپنی ترجمانی نہ کرسکا تو سرکار کی ترجمانی کیسے کرتا؟"

مرزا۔ "مگر آپ کے اندر مطلب کی بات ڈال جانے کا وہی ملکہ ہے جو سرکاری ترجمانوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے خیال ہوا کہ شاید یہ شغل بھی کچھ دن کیا ہو؟"

میں۔ "میں ذرا موٹی عقل کا ہوں اس لیے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

مرزا۔ "مطلب یہ کہ آپ نے بات میں بات پیدا کر کے مطلب کی بات گول کر دی اور عقل بڑی یا بھینس کے اصل مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دیا حالانکہ آج کل اپنے دیس میں کھٹائی گراں اور سونا سستا ہو گیا ہے، اس لیے سناروں نے بھی زیور کھٹائی میں ڈالنا بند کر دیا ہے اور آپ ہیں کہ بات کھٹائی میں

ڈال رہے ہیں۔"

میں ۔۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو بھینس اور عقل میں بڑائی کی بحث سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ آپ کے اصرار سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ آپ کو کتے نے نہیں، بھینس نے کاٹ لیا ہے یا پھر عقل نے اپنے ناخن سے کھرونچ لیا ہو کیونکہ بزرگوں کا کہنا ہے کہ عقل کے ناخن ہوتے ہیں۔ اسی لیے آج کل کی عقل مند عورتیں نوکیلے ناخن رکھتی ہیں تاکہ اپنے بے عقل شوہروں کو عقل کے ناخنوں سے راہ راست پر لا سکیں اور اگر وہ پھر کبھی کج روی کریں تو انھیں دھمکی دے سکیں کہ ؎

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں پھر موضوع سے بہکا جا رہا ہوں لیکن ایسی بات نہیں ہے کیونکہ جس طرح عقل کے ناخن ہوتے ہیں اسی طرح بھینس کے کھر ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ نوکیلے نہیں ہوتے لیکن جس رفتار سے نوکیلے ناخن کا رواج بڑھ رہا ہے اس سے توقع ہے کہ جلد ہی بھینس کے کھر بھی نوکیلے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد وہ دودھ دینے کے بجائے منہ نوچنا شروع کر دے گی۔ تاکہ لوگ بھینس کے بجائے عقل کو بڑا نہ سمجھنے لگیں کیونکہ آج کل بڑا وہی سمجھا جاتا ہے جس کے اندر نوچنے کی اہلیت زیادہ ہو۔ اسی لیے مزدور دن بھر خون پسینہ ایک کرنے کے باوجود چھوٹا اور مالک دن بھر بیٹھے رہنے کے باوجود بڑا خیال کیا جاتا ہے کیونکہ وہ نوچتا جاتا ہے اور مزدور صرف محنت کرتا۔ اور آپ ہی بتائیے کہ کون عقل مند کہے گا کہ بیٹھے بیٹھے نوچ کھسوٹ کے ذریعے گھی چپڑی روٹی کھانا بے وقوفی اور دن بھر پھاوڑا اچلا کر سوکھی روٹی کھانا عقل مندی ہے۔

اسی لیے میرا خیال ہے کہ دہلی مقل سے موٹی بھینس بڑی ہے کیونکہ میں نے اور شاید آپ نے بھی بڑے بڑے دودھ والوں اور مقل مندوں کو سڑک پر گزرتے دیکھا ہوگا لیکن کبھی ان کے انداز میں ٹریفک رکتی نہ دیکھی ہوگی۔ لیکن کس کی مجال ہے کہ بیچ و بیچ سڑک پر اپنی ایک درجن سہیلیوں سمیت ٹہلتی بھینس کے انداز میں سواری سے نہ اتر پڑے۔ سائیکل سوار کس شمار و قطار میں ہیں موٹر نشیں بھی اس کی شانِ بے نیازی سے مرعوب ہو کر کچھ دیر کے لیے موٹر روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور موٹر پہ بیٹھی بیگم سے منہ موڑ کر بھینس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

"بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

کاتب کی فریاد

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اخبارات اور رسائل کے کاتبوں کا کام صرف مضمون نگاروں اور اڈیٹروں کی تحریروں کو نقل کر دینا ہوتا ہے حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ جس طرح بیانات میں لیڈروں کی بھول چوک کی ذمہ داری خواہ مخواہ رپورٹروں کی پتلی گردن پر ڈالی جاتی ہے اسی طرح مضمون نگاروں اور اڈیٹروں کی غلطیوں کا بوجھ کاتبوں کو یہ کہتے ہوئے اٹھانا پڑتا ہے ؎

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

آپ اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو ہمیں اپنے اوپر خود اپنے قلم سے الزام رکھتے وقت محسوس ہوتی ہے۔ اس بے بسی کی بھی کوئی حد ہے کہ ہمیں اپنے قلم سے خود اپنے متعلق لکھنا ہوتا ہے کہ "نقل را چہ عقل، مضمون میں جو غلطی ہوئی ہے وہ دراصل کتابت کی غلطی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی فاش غلطی کسی صاحب قلم سے کیسے ممکن ہے۔"

حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ صاحب قلم بعض وقت اپنے سمندِ قلم کی لگام ایسی ڈھیلی کر دیتے ہیں کہ وہ چوکڑیاں بھر کر تحریر کو اتنا چوپٹ کر دیتا ہے کہ اگر بعد کو وہ خود اپنا لکھا پڑھنے کی زحمت گوارا کریں تو شاید مشکل سے پڑھ سکیں۔

ہمیں اپنے خوش نویس ہونے پر ناز نہیں ہے لیکن ہم ہر وقت دست بدعا رہتے

ہیں لہذا اے خدا تو بعض ایسے صاحب قلم حضرات کے اس خط کی زد سے محفوظ رکھ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”بخطِ موسٰی بخوانند“ خدا معلوم نہیں ایسے لکھنے والوں کو اپنے متعلق موسیٰ ہونے کی غلط فہمی ہے کہ نہیں لیکن نعوذ باللہ ہم خدا ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کر سکتے اس لیے ظاہر ہے کہ اس خط کا پڑھنا ہمارے لیے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مضمون میں ہونے والی تمام غلطیوں کی ذمہ داری تنہا ہماری گردن پہ ڈالی جاتی ہے۔

جہاں تک کتابوں کے کاتبوں کا تعلق ہے وہ اخبار و رسائل کے بدقسمت کاتبوں سے بدرجہا مزے میں ہیں ان کا سابقہ اطمینان سے لکھی گئی کسی ایک آدمی کی تحریر سے ایک عرصہ تک رہتا ہے جس کی وجہ سے تحریر کی اجنبیت دور ہو جاتی ہے لیکن اخبار و رسائل کے بدنصیب کاتبوں کا سابقہ بھانت بھانت کی تحریروں سے ہوتا ہے جو توجل میں آیا والی عجلت میں لکھی جاتی ہیں اور ہمیں اسی عجلت سے انھیں لکھنا بھی پڑتا ہے کیونکہ جس طرح موت کا ایک دن معین ہے اسی طرح اخبار کے کاتبوں کی کارگزاری کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے اس لیے کہ موت ٹل سکتی ہے لیکن اخبار کی اشاعت ٹل نہیں سکتی ایسی ہول جول میں جناتی تحریروں کا لکھنا آپ یقین کیجیے راہ ہفت خواں کے طے کرنے سے کسی طرح کم مشکل نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ اس دشوار کام کی انجام دہی پر آپ نے کبھی کسی اخبار یا رسالے میں ہمارے حق میں ایک کلمۂ خیر بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ہمیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا لیکن ہمارا دل صاحب اولاد سے نہیں اصحاب قلم سے انصاف طلب ضرور ہے کہ اگر وہ ہماری خدمات کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے تو نہ کریں لیکن خدا کے لیے اپنی خامیوں کا ہمیں تختۂ مشق نہ بنائیں اور اپنی غلطیوں کا الزام ہمارے سر نہ دھریں۔

ہمارے ایک کرم فرما ہیں جن کے متعلق ابھی تک ماہرین رسم خط یہ فیصلہ نہیں

کر سکے ہیں کہ وہ کس خط میں اپنے مضامین تحریر فرماتے ہیں ان کا خط اگر خط نستعلیق ہوتا تو بڑی بات ہے خط شکست سے بھی اس کا دور کا تعلق نہیں ۔ ہاں اگر کوئی تعلق ہے تو صرف اتنا کہ دیکھنے میں وہ حروف کا ایسا شکستہ ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے کہ جس میں کسی حرف کا کوئی دائرہ صحیح سلامت نہیں ہوتا اور پوری عبارت ایک ایسی قتل گاہ کا منظر پیش کرتی ہے جس میں سر و پا بریدہ حروف کے لاشے لائن سے لگا دیئے گئے ہوں ۔ ان کی تحریر میں حروف کے دائروں کی کوئی پابندی نہیں ہوتی بلکہ سچ تو یہ ہے ان کے قلم اعجاز رقم نے ایک الگ رسم خط ایجاد کر دیا ہے ۔ انھوں نے اپنے اس ایجاد کردہ خط میں اتنی پختگی پیدا کر لی ہے کہ کبھی سر مو فرق نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کا لکھا ہوا پڑھ کر نہیں پہچان کر لکھ لیتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح آپ اپنے قریب کے لوگوں کو ان کے خد و خال پر غور کیے بغیر نظر پڑتے ہی پہچان لیتے ہیں اسی طرح برسوں سے دیکھتے دیکھتے ان کی تحریر کا نقش ہمارے ذہنوں میں اس طرح کھپ گیا ہے کہ اب وہ ہمارے لئے تحریر نہیں تصویر بن گئی ہے جسے ہم نظر کے سامنے آتے ہی پڑھ نہیں پہچان لیتے ہیں ۔

ایک صاحب اتنے کفایت شعار ہیں کہ وہ حروف کے پورے دائرے لکھنا فضول خرچی خیال کرتے ہیں اور نقطے یا تو رکھتے ہی نہیں اور اگر رکھتے ہیں تو غلط جگہ مثلاً وہ آدم اور آدمی قریب قریب ایک ہی طرح لکھتے ہیں ۔ اسی طرح مبہم میں ب کا نقطہ عام طور پر بہ سلسلۂ کفایت غائب کر کے اسے غریب کاتبوں کے لیے بہم بنا دیتے ہیں جس کا سر کرنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے ۔

ایک دوسرے صاحب اتنے شاہ خرچ واقع ہوئے ہیں کہ ان کی کوئی تحریر اضافوں سے خالی نہیں ہوتی اور لطف یہ ہے کہ لکھتے وقت وہ یہ اضافے

بین السطور میں تیر کا نشان بنا بنا کر نہایت فراخ دلی سے کرتے ہیں جس سے ان کی تحریر اچھا خاصا ترکش بن کر رہ جاتی ہے جس میں عبارت کم اور تیر زیادہ نظر آتے ہیں۔ اور بچارے کاتبوں کو تیروں کی چھاؤں میں ان کی تحریر لکھنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ایک قسم ہے کم فرما ہیں جن کا خط خدا کے فضل سے غنیمت ہے لیکن ان کا قلم اتنا بڑا حرف خور ہے کہ کوئی ایسا پیرا نہیں ہوتا جس میں وہ ان کی نظر بچا کر دو چار لفظ اِدھر اُدھر سے نوش جان نہ کر لیتا ہو۔ اور یہ حرف خوری اس صفائی سے ہوتی ہے کہ ان بچارے کو سن گن تک نہیں ملتی اور جب کبھی ہم لوگ یا پروف ریڈر صاحب ان کے قلم کی اس خرد برد کی طرف توجہ دلاتے ہیں تو وہ اپنے قلم کی اس چوری اور سینہ زوری پر ایسے بے بس نظر آتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں ؎

سامنے بیٹھ کے جو حرف چرائے کوئی
ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی

اور واقعہ یہ ہے کہ بچارے باوجود کوشش کے وہ اپنے قلم کی چوری کا بالکل پتہ نہیں لگا پاتے ہیں کیونکہ جب کبھی انھوں نے ہماری درخواست پر اپنے لکھے ہوئے مضمون پر نظر ثانی کی زحمت گوارا کی تو ان کے رحم دل و دماغ نے شاید قلم کی چوری چھپانے کے لیے تمام غائب الفاظ حاضر کر دیئے اور وہ نہایت روانی سے سب صحیح پڑھتے چلے گئے اور انھیں یہ محسوس تک نہ ہوا کہ کہیں کوئی لفظ غائب ہے۔ اس وقت سے ہم انھیں نظر ثانی کی خواہ مخواہ زحمت دینے کے بجائے الشاید ھسا جو سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتے ہیں اور اپنے سر الزام لے لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے لڑکیوں کے چست لباس پر پابندی کے سلسلے میں

ایک خبر لکھ کر کتابت کے لیے بھیجی کہ اسکولوں اور کالجوں میں لڑکیوں کے لیے چست لباس کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس خبر میں "لباس" تو ان کا لفظ خود قلم حسب عادت چھپکے سے چپٹ کر گیا اور "چست" کے دو نقطے شاید لباس کی تنگی سے تنگ آکر غائب ہو گئے اور اچانک خبر چھلانگ مار کر کہاں سے کہاں پہونچ گئی یعنی اس نے یہ شکل اختیار کر لی کہ اسکولوں اور کالجوں میں لڑکیوں کے لیے جست کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ نقل راچہ عقل کے باوجود ہم خبر کی اس چھلانگ پر چونک پڑے اور ہم نے جب پروف ریڈر صاحب کے ذریعہ اپنے کرم فرما کی توجہ ان کے قلم کی اس خرد برد کی طرف دلائی تو وہ بھی بے ساختہ اچھل پڑے۔

ہم اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اخبار میں کام کرنے والے ساٹھ فیصدی اڈیٹروں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم ہر آنے والے مہینے کے شروع میں کافی چوکنا رہتے ہیں کیونکہ وہ ہفتے ڈیڑھ ہفتے خبروں میں بدستور پچھلے ہی مہینے کا نام ڈالتے رہتے ہیں اور ہمارے کاتب عقل نہ رکھنے کے باوجود عقلمندوں کی اس غلطی کو خاموشی سے ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی اڈیٹر صاحبان صرف بدلنے والے مہینوں ہی کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ بدلنے والے وزیروں کے معاملہ میں بھی ان کا رویہ یہی رہتا ہے اور وہ کچھ عرصہ تک سبکدوش ہونے والے وزیروں کو وضعداری میں بدستور ان کے عہدوں پر برقرار رکھتے ہیں مثلاً برطانیہ میں لیبر پارٹی کی کامیابی کے باوجود ہفتوں ہمارے اڈیٹر صاحبان کے قلم نے وزیر اعظم ولسن کے بجائے لارڈ ہیوم ہی کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا اور خبروں میں برطانوی وزیر اعظم ہیوم ہی لکھا گئے اور ہم بے عقل کاتب زبان پر حرف شکایت لائے بغیر درست کرتے اور اخبار کو پڑھنے والوں کی لعن طعن سے بچاتے رہے۔

مضمون یا خبر لکھتے وقت ہمارے اڈیٹر صاحبان اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ انھیں

تن من کی خبر نہیں رہتی خیر تن کی بے خبری تو ان کا نجی معاملہ ہے اور اس کا کوئی خاص اثر ہم کاتبوں پر نہیں پڑتا لیکن من کی بے خبری کاتبوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتی ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ جب وہ جوش میں آکر سلپوں پر سلپیں بھیجنے لگتے ہیں تو دو چار سلپوں کے بعد محویت کے عالم میں یا تو سلپوں پر نمبر ہی ڈالنا بھول جاتے ہیں یا غلط نمبر ڈال دیتے ہیں اور اس غلطی کی وجہ سے مضمون کی جو درگت بن جاتی ہے اسے بھی اڈیٹر صاحب کی بے خبری نہیں کاتب کی بے عقلی ہی پر محمول کیا جاتا ہے اور اگر اتفاق سے پروف ریڈر صاحب بھی اڈیٹر صاحب کی طرح بے توجہی برت جائیں تو پڑھنے والوں کے لیے مضمون ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے اور جب معذرت شائع کی جاتی ہے تو دونوں صاحبوں کی لاپروائی کا ذمہ دار تنہا بچارے کاتب ہی کو ٹھہرایا جاتا ہے جس کی دراصل کوئی غلطی نہیں ہوتی۔

یقین کیجیے کہ ان ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتے بھگتے ہم بے زبان کاتبوں کے دل کی حالت بالکل ایسی ہوگئی ہے کہ ؎

پُر ہوں شکووں سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں اڈیٹر صاحبان ہمارے اس شکوے کو بھی ہماری بے عقلی پر محمول کرکے اسے چھاپنے کے بجائے معذرت کے ساتھ واپس نہ کر دیں اس لیے ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہماری شکایت کو مغائرت نہیں محبت کا نتیجہ خیال کیا جائے گا کیونکہ شاعر نے اس شعر میں ہماری دلی حالت ہی کی ترجمانی کی ہے ؎

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے ——— اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

ماہِ جولائی کی مہم

لڑکوں کا امتحان اپریل میں اور سرپرستوں کا امتحان جولائی میں ہوتا ہے جب وہ امتحان کے ڈر سے نہیں بلکہ کتابوں اور کاپیوں کی فرمائش سے ایسے حواس باختہ نظر آتے ہیں جیسے امتحان کے زمانے میں طالب علم۔

اس مہینے میں سرپرستوں کو شروع سے ہی چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اگر خدانخواستہ صاحبزادے فیل ہوگئے تو ان کو تسلی اور ڈھارس دلانے کے ساتھ ساتھ دو چار دن ان کی نگرانی بھی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں غیرت مند صاحبزادے خودکشی کے ارادے سے گومتی کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں۔ اور اگر پاس ہوگئے، تو پاس ہونے کی خوشی کا مزا آنے والے مصائب کے تصور سے بالکل اسی طرح کرکرا ہو جاتا ہے جس طرح وصل کا مزہ ہجر کے دھڑکوں سے۔

صاحبزادے کے پاس ہونے کی شکل میں سب سے پہلی مصیبت جس کا سامنا بیچارے سرپرستوں کو کرنا پڑتا ہے وہ ہے پاس پڑوس اور جان پہچان کے لوگوں کی جانب سے مٹھائی کا تقاضا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کے اس میٹھے تقاضے پر آپ کا بدمزہ ہونا کتنی بدذوقی ہے پھر آپ کا دل بھی تو اپنے جگر گوشے کی کامیابی پر خوشی میں مٹھائی کھانے اور کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ آپ کی جیب کا خالی پرس آپ کے دل پر پتھر کی سل بن کر اس طرح رکھا ہوتا ہے

کہ خوشی کی ابھرتی ہوئی ننھی ننھی لہریں سے ٹکرا کر خون ہو جاتی ہیں اور مٹھائی کے تقاضے پر مسکرانے کے باوجود آپ دل ہی دل میں روتے ہوتے ہیں اور شاید اسی غم کی ماری ہنسی کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؎

ہماری ہنسی پر ہے قربان رونا
غموں کا چھپانا کچھ آساں نہیں ہے

مٹھائی کا تقاضہ کرنے والے سمجھ دار لوگ آپ کی مسکراہٹ کے پیچھے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی جھلک دیکھ کر سہم جاتے ہیں اور انھیں دوبارہ تقاضے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس طرح آپ ماہ جولائی کے پہلے مرحلے سے جس کوفت کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں اس کا تکان مہینوں رہتا ہے۔

ابھی یہ تکان دور بھی نہیں ہونے پاتا کہ داخلہ کی مہم سر کرنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ترقی پذیر ملک کی آگے بڑھتی ہوئی معیشت میں زندگی کی دوڑ کافی تیز ہو گئی ہے تعلیم کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا رجحان شہروں اور قصبوں کو پار کر کے گاؤں اور قریوں تک پہونچ گیا ہے اس لیے جولائی کے پہلے ہفتے میں اسکولوں اور کالجوں کے سامنے حشر کا سا منظر نظر آتا ہے اور نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص اپنی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ پیر خود درماندہ شفاعت کس کی کریں۔ جس کو دیکھیے صاحبزادے یا صاحبزادی کو ساتھ لیے فارم داخلہ حاصل کرنے یا فارم داخلہ داخل کرنے کے لیے لائن لگائے کھڑا ہے۔

سال میں یہی ایک مبارک مہینہ ہوتا ہے کہ خدا اپنے مظلوم بندوں یعنی استادوں اور استانیوں کو ان کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں اور بے اعتنائیوں کا بدلہ لینے کا موقعہ عطا فرماتا ہے۔ اور ان میں سے بہت کم ایسے ناشکرے

ہوتے ہیں جو اللہ کی جانب سے دیئے گئے اس نادر موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے ظاہر ہے خوشامدوں اور سفارشوں کی اس بھرمار سے استاد کیا اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کی گردن میں کچھ کجی آجانا یقینی ہے پھر سفارشیں بھی کیسی پڑوس اور محلے کی نہیں دوست اور احباب کی بھی نہیں بلکہ اونچے نیتاؤں اور بڑے وزیروں کی۔

چونکہ حضرت حوّا آدم کے جنت سے نکالے جانے کا باعث ہوئی تھیں شاید اسی بنا پر اسکولوں میں لڑکوں کے بہ نسبت لڑکیوں کو زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے بعض تو ایسے نک چڑھے گرلس اسکول ہیں کہ وہاں داخلہ تو درکنار فارم داخلہ حاصل کرنے کے لیے پاسبان کے پاؤں پکڑنے تک کی نوبت آجاتی ہے۔

آپ کی کوشش سے نہیں محض خدا کی مرضی سے اگر کسی اسکول میں اللہ اللہ کرکے آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادی کا داخلہ ہو گیا تو یہ نہ سمجھئے کہ آپ نے ماہ جولائی کی مہم سر کرلی بلکہ یہ سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آپ نے صاحبزادے کا داخلہ نہیں کرایا بلکہ آپ نے اپنے لئے مصائب کا دروازہ کھول دیا ہے۔

نیچے درجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی فیس معاف ہونے کے باوجود آپ کو ہر ماہ نئی مدوں کے ماتحت فیس کی معافی کے معاوضہ میں فیس سے کہیں زیادہ رقم پابندی سے ادا کرنی ہوگی اور اس خوش فہمی میں بھی مبتلا رہنا پڑے گا کہ آپ کے بچے مفت تعلیم پا رہے ہیں۔

آپ نے یہ مثل سنی ہوگی کہ ٹکے کی بابیل نو ٹکے منڈائی۔ آپ کے صاحبزادے ابھی چھٹے ہی درجے میں تعلیم پا رہے ہیں لیکن ان کی کتابوں اور ان سے کہیں زیادہ کاپیوں کی فہرست اتنی لمبی ہوگی کہ اس کی لمبائی راشن کی دوکان پر لگی ہوئی لائن سے بھی آگے نکلتی نظر آئے گی اور آپ کے ہاتھ سے گھبراہٹ میں راشن کارڈ گر جائے گا اور وہ رقم جو آپ نے دوسرے مد میں رکھوا رکھے

کے راشن کے لیے رکھی تھی وہ کتابوں اور کاپیوں کی نذر ہو جائے گی اور اس کے بعد بھی فاؤنٹین پن اور اسکول کے ڈریس کے لیے تقاضہ جاری رہے گا۔

گھر جھانک لڑکی تاک خاتون

ہم اب تک سمجھتے تھے کہ آجکل خالی مکان اور با روزگار لڑکا ملنا دشوار ہوتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ نہیں شہر میں لڑکی کی تلاش میں بھی گلیوں کی خاک چھانی اور گھروں کے دروازے جھانکے جاتے ہیں۔ اور یہ کام بطور ضرورت نہیں، بلکہ بطور رسم کیا جاتا ہے۔

چنانچہ آج جب ہم آنگن میں بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے اور اخبار پڑھ رہے تھے کہ دروازے پر کچھ کھٹ سے ہوا اور ہم نے نظر اٹھا کے دیکھا تو ایک خاتون نقاب الٹے کواڑ سے منہ نکالے جھانک رہی تھیں صورت بالکل اجنبی تھی کیونکہ تاک جھانک کی عادت نہ ہونے کے باوجود ہمیں اپنی بیگم کی تمام سہیلیوں کی زیارت مختصر سے فلیٹ کی بدولت گھر میں آتے یا گھر سے باہر نکلتے وقت اچٹتی نظروں سے اتنی بار ہو چکی تھی کہ بلا تعارف کے اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ لیکن کانا پردہ جاری تھا اور ہمیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ ہم حسرت صاحب کی طرح اجنبیت کے مزے سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اجنبی صورت دیکھ کر ہم نے بیگم کو پکارا اور خود اخبار اٹھا کر کمرے کے اندر چلے گئے۔ لیکن یہ فکر ضرور رہی کہ یہ نو وارد ہیں کون؟ اس طرح اچانک اجنبی آنے والی خواتین میں عام طور پر یا تو کوئی مصیبت زدہ بیوہ ہوتی ہیں جن کے باحیثیت شوہر

کسی فرضی بلوے یا فساد کا شکار ہو کر انھیں اتنا حواس باختہ کر جاتے ہیں کہ اچھی خاصی صحت ہونے کے باوجود محنت کے بجائے مانگنے کھانے پر مجبور ہو جاتی ہیں یا پھر خاندانی منصوبہ بندی (فیملی پلاننگ) کی کوئی خاتون ہوتی ہیں جو اپنی کارگزاری کی خانہ پری کے لئے گھروں میں تاک جھانک کرتی پھرتی ہیں۔

لیکن یہ جھانکنے والی اجنبی خاتون ظاہر ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی سے تعلق نہیں ہو سکتی تھیں اسلئے کہ انھوں نے جھانکنے کے بعد ہمیں دیکھ کر بلا جھجھک مسکراتے ہوئے "کیا میں آسکتی ہوں؟" کہنے کے بجائے جلدی سے اپنے آفتابی چہرے پر اس طرح سیاہ نقاب ڈال لی جیسے کہ سورج نے جھانک کر پھر ابر میں منھ چھپا لیا ہو۔

ہلکی بدلی کی وجہ سے آج سورج بڑی دیر سے یہ تاک جھانک کر رہا تھا اسلئے میری نظران کے اس طرح نقاب ڈال لینے سے زیادہ جھجھکی نہیں بلکہ چلتے چلاتے ہم نے ان کے چہرے کا ایک سرسری جائزہ لے ہی لیا وہ اپنے لباس سے کھلتے پیتے گھر کی اور چہرے سے بے پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھیں۔ کیوں کہ چہرے پر جیک تھی نور نہ تھا۔ بیگم نے میرے اندر چلے جانے کے باوجود کمرے کے سامنے صحن میں انھیں بٹھانا شدید احتیاط کے خلاف سمجھا۔ بیگم مجھ پر پورا بھروسہ کرنے کے باوجود مردوں کے ندیدے پن کی بنا پر ان معاملات میں کافی چوکنا رہتی ہیں حالانکہ وہ یہ نہیں جانتیں کہ دید پر پابندی لگانے ہی سے ندیدہ پن پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ آنکھوں کو موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے کان ندیدے پن پر اتر آئے اور وہ باتیں سننے لگے جو بغل والے کمرے میں ہو رہی تھیں ———— کمرے میں گھر کی لڑکیوں کے علاوہ اس وقت محلے کی بھی کچھ لڑکیاں بیٹھی اور آج پکنک کا کوئی پروگرام بنا رہی تھیں۔ جب انھوں نے ان اجنبی خاتون کو اپنی طرف بار بار نظریں بچا کر دیکھتے دیکھا تو وہ تاڑ گئیں کہ ہو نہ ہو یہ بھیڑی منڈی میں بکریاں دیکھنے نہیں بلکہ گھر کو

میں لڑکیاں دیکھنے کی غرض سے نکلی ہیں۔

لیکن بیگم مہمان کے ناخواندہ ہونے کے باوجود اس کی خاطر مدارات کے لئے جلدی سے باندان گھسیٹ کر پان لگانے لگیں۔ اور لڑکیوں نے سوالات کی بوچھار شروع کر دی آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں۔ کیسے زحمت فرمائی۔ دولت خانہ یہیں ہے یا کہیں باہر سے آنا ہوا؟۔

تابڑ توڑ سوالات سے وہ کچھ گھبرا سی گئیں۔ وہ یہ کیسے کہتیں کہ میں اپنے بیرن بھیا کے لیے ایک چاند سی دلہن تلاش کرنے ستو باندھ کر نکلی ہوں نہیں معلوم کتنے گھر جھانک چکی ہوں۔ اور ابھی کتنے جھانکنے ہیں۔ ———— بات یہ ہے کہ گھر جھانک لڑکی تاک قسم کی عورتوں کو یہ ایک لت سی ہو جاتی ہے اور اگر وہ دن میں دو چار گھر نہ جھانکیں تو شاید گھر میں بیٹھے بیٹھے جماہیاں لیتے لیتے ان کا بدن ٹوٹنے لگے۔

اجنبی خاتون نے بات بنانے کے لئے پہلے تو یہ کہا کہ اس گلی میں کوٹھے پر ایک داروغہ صاحب آ کر رہے ہیں ان کی بیوی ہماری رشتے کی بہن ہیں ایک مرتبہ زنانے پارک میں اتفاق سے مل گئیں اور انھوں نے لپک کر گلے سے لگا لیا برسوں کے بعد ملی جو تھیں اور اسی وقت ساتھ لے آئیں ان کے یہاں کا زینہ بھی ہو بہو ایسا ہی تھا معاف کرنا بہن! میں اسی کے دھوکے میں ادھر چلی آئی۔ اس کے علاوہ مجھے ایک خالی مکان کی بھی تلاش تھی!۔

اس پر ایک لڑکی بولی مگر یہ مکان تو آدمیوں سے بھرا پڑا ہے اور یہ کہہ کر سب لڑکیاں اس طرح مسکرا دیں کہ کمرے میں اجالا سا ہو گیا اور لڑکیوں کی متلاشی اجنبی خاتون کی آنکھیں کچھ چوندھیا سی گئیں لیکن وہ اپنے کام میں کافی منجھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اس لئے انھوں نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے بیگم کے ہاتھ سے گلوری لے لی

اور منہ میں رکھتے ہوئے اُن سے مخاطب ہو کر کہا اللہ نظر بد سے بچائے یہ صاحبزادیاں آپ ہی کی ہیں؟۔

بیگم اس ڈر سے کہ کہیں آگے چل کر وہ یہ مشورہ نہ دینے لگیں کہ اب آپ آپریشن کرا لیجیے، گھبرا کر بولیں، نہیں تو دو ہی لڑکیاں ہیں باقی ہمارے پڑوس والی بہن کی صاحبزادیاں ہیں دراصل بیگم کو ان کے اس سوال پر کچھ ناگواری سی بھی ہوئی کیونکہ وہ لڑکوں اور دو لڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ اپنے کو ابھی اتنا بوڑھا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھیں کہ ان پر آدھا درجن سے زائد لڑکیوں کی ماں ہونے کا شبہ کیا جانے لگے۔

اس کے بعد انھوں نے بڑی لہک سے کہا آپ بڑی خوش قسمت ہیں ماشاء اللہ لڑکیاں بڑی سعید اور سلیقہ مند معلوم ہوتی ہیں جس گھر میں جائیں گی جنت بنا دیں گی۔ بیگم کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا انھوں نے لڑکیوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں فوراً کمرہ بدر ہونے کا حکم دیا اور خود بڑے خلوص سے بولیں کہ بہن لڑکیاں سلیقہ مند بھی ہیں اور نیک بھی لیکن ان کی وجہ سے دن رات ہر گھڑی سر پر ایک بار سا رہتا ہے۔ اُنھیں تو بس لڑکیوں کو پڑھانے کی دھن ہے۔ میں کہتی ہوں کیا نوکری کرانا ہے جو بی اے پاس کریں۔ ماشاء اللہ انٹرینس پاس کر چکی ہے۔ دوسری بی اے میں ہے اب خواہ مخواہ پڑھائی میں پیسہ اور وقت ضائع کرنے سے فائدہ کہیں کوئی اچھا گھر ڈھونڈھ کر لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دیں زندگی موت کا کیا ٹھیک کون جانے موت کی گھڑی کب آ جائے مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی بھلا تمہیں بتاؤ بہن میں عورت ذات لڑکیوں کے لیے اچھا بر ڈھونڈنے کہاں جاؤں اللہ تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہو تو بہن تمہیں بات چیت چلاؤ۔ اور یہ کہتے کہتے انھیں خاطر مدارات کا خیال آ گیا اور انھوں نے پکار کر کہا ذکو دیکھو خالہ کے لیے

جائے تو لاؤ۔ کیا پان ہی پر ٹرخا دو گی۔

اجنبی خالہ نے پہلے تکلف سے کام لیا اور کہنے لگیں نہیں اس کی کیا ضرورت میں تو چائے وائے پی کر گھر سے نکلی تھی مگر جب بیگم نے زیادہ اصرار کیا اور کہا دیکھو کیسی بدلی چھائی ہے میرا کلیجہ تو سردی سے کانپ رہا ہے تب انھوں نے بھی کہا خیر ایک پیالی چائے پی لوں گی مگر بہن دیکھو اور کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں ناخواندہ مہمان بن کر تمہارے سر پہ نازل ہو گئی۔

مگر کیا کروں بہن جس طرح تمھیں لڑکی کی فکر سے چین نہیں آتا اسی طرح اپنے جوانوں تندرست پڑھے لکھے بارو زگار بھائی کو دیکھ دیکھ کر میرا دل سوس سوس کر رہتا ہے اور دن رات اسی تلاش میں رہتی ہوں کہ کوئی ایسی مناسب لڑکی نظر پڑ جائے جو پڑھی لکھی اور سلیقہ مند ہونے کے ساتھ صورت شکل کی بھی بری نہ ہو بس ہمیں لوگوں جیسی ہو بے جوڑ نہ معلوم ہو اور یہ کہتے کہتے ان کے چہرے پر نور حسن کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور انھوں نے صاف چہرے پر لٹکی ہوئی کالے بالوں کی وہ لٹ ایک ادا سے ڈوپٹے سے ڈھنک لی جس میں سے چاندی جیسے ایک آدھ بال سورج ڈھلنے اور تاروں بھری شام کی آمد کی اطلاع دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ جملہ بھی لگا دیا کہ ہمیں دان دھیز کی کوئی زیادہ پروا نہیں ہے اچھے گھرانے کے لوگ تو خود ہی دان دہیز میں اپنی والی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ہمیں پیسے کا بھی کوئی لالچ نہیں لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں چار بھائی برادری میں ناک نہ کٹے۔ اور ناتے رشتے کے لوگ ناک بھوں نہ چڑھائیں۔

بیگم ان کی باتیں سنتی جاتی تھیں اور اس معیار پہ اپنی لڑکیوں کو جانچنے

کی کوشش کی جاتی تھیں جو اجنبی بہن بتا رہی تھیں۔

لڑکیاں سلیقہ مند تو ہوئی ہیں، صورت شکل بھی ان سے اچھی نہیں تو ان سے کم بھی نہیں، بڑی لڑکی تو ماشاء اللہ سے بی اے میں پڑھ ہی رہی ہے اللہ نے چاہا تو بات پکی ہونے تک بی اے پاس ہی کر لے گی، رہا دان دہیز۔ اس پر آ کر ان کی سوچ میں کچھ بریک سا لگ جاتا اس لئے کہ اس سلسلہ میں اجنبی بہن نے جو بات کہی تھی اس میں بڑی گنجائش تھی وہ بڑھ کر اتنا اونچا بھی ہو سکتا تھا کہ ان کی پہونچ سے بہت پرے ہو جائے اور گھٹ کر اتنا بھی ہو سکتا تھا کہ جسے وہ سُرکھب کر پورا کر سکیں لیکن بات نہ صاف ہونے کی بنا پر وہ بے اطمینانی سی محسوس کر رہی تھیں۔ مگر اس بات سے ضرور خوش تھیں کہ چلو کہیں بات تو چلی آگے بڑھ کر جہیز کا مسئلہ بھی صاف کر لیا جائے گا۔ لڑکی کو دلہن بنانے کے خیال ہی سے ان کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ اور انھیں چین نہ پڑا اور وہ خود اٹھ کر باورچی خانے میں پہونچ گئیں تاکہ خاطر مدارات کا خاطر خواہ انتظام کر سکیں۔

ابھی وہ چائے وغیرہ کا سامان کمرے میں بھجوانے کا انتظام کر رہی تھیں کہ ان کی چہیتی سہیلی بدر بہن اپنی صاحبزادی کی تلاش میں برقعہ اتارتی ہوئی آنگن میں آ کر کھڑی ہو گئیں اور ناشتے کے انتظامات دیکھ کر بولیں کیوں نہ ہو ہماری طلعت باجی ہمیں اتنا چاہتی ہیں کہ انھیں ہمارے آنے کی خبر ہمارے آنے سے پہلے ہی ہو جاتی ہے۔ مگر باجی اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی روزانہ کے آنے جانے والوں کے ساتھ ایسا تکلف نہیں برتا جاتا ہے۔ اس پر ان کی صاحبزادی تسنیم نے ابنی سہیلی ذکو کے چٹکی لی اور کہا کہ یہ روزانہ کے آنے والوں کے لئے انتظامات نہیں ہو رہے ہیں بلکہ، خاص مہمان کے لئے خاص اہتمام کیا جا رہا ہے تسنیم نے خاص، پر اتنا زور دیا کہ ان کی ماں کی نظریں خاص مہمان کی تلاش میں کمرے کے اندر

پہونچ گئیں اور خاص مہمان کو دیکھ کر ان کی ساری خوش مزاجی یکدم غائب ہو گئی بعد چہرے پر ایک قسم کی ایسی غضبناک سنجیدگی طاری ہو گئی جس کا مطلب اس وقت کوئی نہ سمجھ سکا۔

اِدھر خاص مہمان نے جب ان کی صورت دیکھی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بڑی مشکل سے اس کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ سکا یہ سلام کا بھی جواب دیتی اور اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور انھوں نے آتے ہی کہا کہ آپ اپنی لڑکی ڈھونڈھ مہم کے سلسلے میں تشریف لائی ہوں گی معاف کیجئے گا میں آپ سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ آخر آپ کو کیا مرض ہو گیا ہے کہ آپ دن میں جب تک دو چار گھر لڑکی کی تلاش میں نہ جھانک لیں اس وقت تک آپ کو چین ہی نہیں ملتا۔ ابھی دو ہی ہفتے ہوئے میں نے آپ کو بیرونی خندق میں اپنی چچی کے یہاں اسی مہم کے سلسلے میں دیکھا تھا بعد کو معلوم ہوا کہ آپ مہینوں انڈے پراٹھے کھانے کے بعد ایسی غائب ہوئیں کہ جیسے کہ ہماری چچی کے دماغ سے عقل غائب ہو گئی تھی۔ اب آپ شاید یہاں ہماری سیدھی سادھی طلعت باجی پر اپنے پڑھے لکھے، تندرست، باروز گار بھائی کی نسبت کا جال پھینکنے آئی ہیں۔ دیکھئے بے تکلف ہر طرف میں صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر آپ اپنی کرکری کرانا نہ چاہتی ہوں تو مہربانی کر کے فوراً اسی وقت یہاں سے تشریف لے جائیں ورنہ میں سب کے سامنے آپ کی قلعی کھول کر رکھ دوں گی۔ خوب رہی آپ کی نظر میں کہیں کوئی لڑکی جچتی ہی نہیں۔

اتنے میں ان کی ذکو باجی نوکرانی کے ساتھ کشتی میں چائے اور ناشتے کا ڈھیر سا سامان لے کر پہونچ گئیں مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اجنبی بہن سے کھانے کے لئے کہیں وہ ناشتے کی کشتی پر حسرت بھری نظر ڈالتی ہوئی اس تیزی

سے گھر سے باہر نکل گئیں کہ یہ ہکّا بکّا ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ؎

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

ہمارے کرم فرما

دفتر جاتے ہوئے ایک کرم فرما راستے میں ملے۔ انھیں دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا۔ ابھی میں حواس بجا بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ حملہ آور ہو گئے اور انھوں نے پوچھا کیا آپ دفتر جا رہے ہیں۔

میں نے کہا جی ہاں! وہ بولے میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا خیریت تو ہے؟ کہنے لگے اللہ کا شکر ہے۔ میں نے کہا انتظار بے علت نہیں ہوتا، فرمایئے کیا کام ہے؟

اب وہ جواب دینے کے بجائے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے اور میری جان نکل گئی کہ ہو نہ ہو کوئی غزل یا نظم اس ہدایت کے ساتھ سپرد کرنے والے ہیں کہ اسے کسی نمایاں جگہ پر شائع کر دیجئے۔

میں وہیں کھڑا ہو گیا کہ کہیں غزل کے ساتھ وہ بھی دفتر نہ پہونچ جائیں اور بطور نمونہ کوئی غزل نہ سنانا شروع کر دیں۔ میرے ساتھ وہ بھی کھڑے ہو گئے اور اپنی جیب سے مختلف سائز اور رنگ کے کئی پرچے نکال کر میری طرف بڑھائے اور کہا یہ تینوں تازہ ترین غزلیں ہیں جو چاہیں شائع کر دیجیے۔

میں نے کہا کہ اگر انتخاب کی زحمت آپ خود فرما لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا انھوں نے کہا یہی تو مشکل ہے ہر غزل اپنی جگہ پر یکتا ہے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ کون

زیادہ اچھی ہے اور کون کم بہتر تو یہی ہوتا کہ آپ باری باری تینوں شائع کر دیتے میں نے کہا شاید آپ کو علم نہیں کہ غزل اور نظم شائع کرنے کا کام جن صاحب کے سپرد ہے وہ مجھے اپنا بزرگ سمجھنے کے باوجود میری طرف سے کافی مشتبہ ہو چکے ہیں اس لیے کہ میرے ذریعہ غزلوں اور نظموں کی درآمد کا اوسط روزانہ چار پانچ ضرور ہوگا۔ تو خیال فرمائیے کہ جب میں ایک ہی صاحب کی تینوں غزلیں ایک ساتھ ان کے سر تھوپ دوں گا تو کیا وہ یہ شبہ کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ میں نے اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ یہ سائڈ بزنس کر رکھا ہے۔

میری اس صاف گوئی کو شاید انھوں نے شعر و ادب کی شان میں بے ادبی خیال کیا اور ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے لیکن انھوں نے اپنی ناخوشی قابو میں رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا کہ آپ نے تو ہر مال کے سیر لگا دیا اور پھر ظلم یہ کہ مال پرکھے بغیر۔ میں نے کہا حضور! جب گودام میں مال بھرا پڑا ہو اور تل رکھنے کی گنجائش نہ ہو تو آپ ہی سوچیے کہ تینوں غزلوں کی ایک ساتھ کھپت کیسے ممکن ہے۔ اب رہا پرکھنے کا سوال تو مجھے تو آپ بھاڑے کا ٹٹو خیال کیجیے جو مال لاد کر منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں پرکھ کر اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟

انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ یہاں ایک نظر ڈال لیتے تو جو کمی بیشی ہوتی ہیں پوری کر لیتے۔

میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں اپنا یہ دستور رہا ہے کہ دوست، احباب اپنا جو قیمتی شعری سرمایہ میرے سپرد کرتے ہیں میں نہایت دیانت داری سے بغیر ہاتھ لگائے جوں کا توں جوہری کے سامنے یہ کہہ کر رکھ دیتا ہوں کہ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

اس کے بعد ان کی تینوں غزلیں ان کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیں اور ان سے رخصت ہو کر چلنے لگا لیکن وہ میرے ساتھ اس طرح ہو لئے جیسے جھوٹے کو گھر تک پہنچانے جا رہے ہوں لیکن نہ میں جھوٹ بولا تھا اور نہ گھر جا رہا تھا اس لئے میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چار قدم چلنے کے بعد وہ ایک پان والے کی دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور مجھے روک کر کہا پان تو کھاتے جائیے۔

لیکن شعر و شاعری سے بے تعلقی کی بنا پر پان کھانے اور سگرٹ پینے کی بھی عادت نہیں اس لئے میں نے معافی چاہی اور کہا میں پان نہیں کھاتا کہنے لگے اس سے کوئی پیٹ تو بھرتا نہیں کھائیے، تھوک دیجئے گا۔

میں نے کہا اسی لئے تو کھاتا نہیں کہ پیٹ بھی نہ بھرے اور تھوکنا گھاتے میں پڑے۔ انھوں نے بڑی لہک سے کہا پھر سگرٹ ہی سے شوق فرمائیے، یہ تو پینے کی چیز ہے۔ سنا ہے اخبار نویس پینے کی کسی چیز سے انکار نہیں کرتے۔

اب نجات کی کوئی صورت نہیں تھی اس لئے میں نے محض پیچھا چھڑانے کے لئے سگرٹ لے لی اور ابھی منہ میں اچھی طرح لگائی بھی نہ تھی کہ انھوں نے جلتی ہوئی دیا سلائی میرے منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا، شوق فرمائیے۔ مجھے نہ سگرٹ کا شوق ہے اور نہ منہ جلانے کا اسی لئے میں گرم جائے بھی منہ سے نہیں لگاتا لیکن جلتی ہوئی دیا سلائی منہ کے اتنے قریب دیکھ کر مرتا نہ تو کیا کرتا کے مصداق سگرٹ جلانے کی کوشش کی جو ادھ جلی رہ گئی اور دیا سلائی بجھ گئی۔ انھوں نے دیا سلائی نکالنے کے لئے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں دیا سلائی کے ساتھ غزل کا کوئی اور پرچہ نہ نکل آئے۔ میں نے کہا تکلیف نہ فرمائیے ٹھیک ہے۔ اور یہ کہہ کر جلدی جلدی کش لے کر بے تکے پن سے انجن کی طرح منہ سے دھواں پھینکنے

لگا۔ اس پر انھیں ہنسی تو ضرور آئی ہو گی لیکن انھوں نے میری بے ڈھنگی سگرٹ نوشی پر اس طرح دیکھا جیسے کہ بے تکی شعر خوانی پر مروت میں داد دے رہے ہوں۔

اب ہم دونوں دفتر کے احاطے میں پہنچ چکے تھے میں نے زینے پر پاؤں رکھتے ہوئے خدا حافظ کہا اور انھوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے منہ سے نہیں نظروں سے کہا کہ میرا لیئے گا نہیں غزلیں شائع نہ ہوئیں تو ساری محنت اکارت جائے گی۔

خدا خدا کر کے ان سے پیچھا چھوٹا تو سگرٹ پھینک کر جلدی جلدی کمرے کی طرف بڑھنے لگا لیکن ابھی چق اٹھا کر اندر داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ السلام علیکم کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ اور ابھی اچھی طرح جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ انھوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن میں سمجھا کہ غزل کا پرچہ بڑھا رہے ہیں اسلئے کچھ جھجکا لیکن ان کا ہاتھ خالی تھا۔

ایک گونہ اطمینان ہوا اس لئے ہاتھ ملا کر خیریت دریافت کی اور آمد کا سبب پوچھا۔ کہنے لگے دو ماہ کے اندر دو مراسلے بھیج چکا ہوں جس میں سے ایک شائع ہوا تو اس میں مطلب کی بات ہی غائب تھی۔ میں نے کہا مراسلہ تھا کاہے کے بارے میں کہنے لگے بیٹھیئے تو بتاؤں میں نے دل میں کہا اللہ خیر کرے آج رنگ بے ڈھب ہے۔ دو غزلیں جیب میں ہیں تیسرا مراسلہ سامنے اور پیغام زبانی سنانے کی دھمکی الگ سے۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ اتنی دور سے خود آنے کی کیا ضرورت تھی خط بھیج دیتے۔ کہنے لگے دو خطوں کا تو یہ حشر ہوا تیسرا بھیجتا تو تین تیرہ، تیس دن ہی منحوس ہوتے ہیں اس کے شائع ہونے کی کیا توقع تھی۔ میں نے کہا کہ تو کیا آپ نے خاص طور پر اسی لئے جاڑے پالے میں یہ سفر اختیار کیا۔ چائے منگواؤں؟ کہنے

بڑی مہربانی، میں چائے نہیں پیوں گا۔ میں نے کہا سردی میں سفر کے بعد چائے فائدہ کرتی ہے۔

انھوں نے بات ٹالتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ بہت دنوں سے تحصیل نہیں آئے، میں نے کہا زمینداری ختم ہوگئی، بانڈ بک گئے اب نہ مال گزاری ادا کرنا ہے اور نہ معاوضہ وصول کرنا ہے۔ کہنے لگے کچھ سیر، در نہیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ میرے سوال کا جواب ٹالنے کے لیے یہ جوابی حملے کر رہے ہیں۔ ابھی وہ دوسرے سوال کے لئے پر تول ہی رہے تھے کہ میں نے بچاؤں کے لئے پھر وہی سوال دہرایا کہ محض مراسلے کے لئے آپ نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کیوں گوارا کی۔

اب جواب دئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اس لیے کہنے لگے ضمنی طور پر ایک اور کام تھا۔ بات یہ تھی کہ بہت سے لوگ ہاکی میچ دیکھنے کے لئے فتح پور سے لکھنؤ آرہے تھے مجھے بھی بچپن سے کھیلنے کا نہیں کھیل دیکھنے کا شوق رہا ہے۔ دل میں خیال کیا ایک کاج دو مینتھ میچ بھی دیکھ لوں گا۔ مراسلہ بھی دے دوں گا اور آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ تو ایک کاج تین مینتھ ہو گئے اس سے وہ بھی محظوظ ہوئے اور خوشی سے مراسلہ بڑھاتے ہوئے کہنے لگے ممکن ہو تو اسے آج ہی شائع کر دیجیے۔ اس کے بعد دارو غہ سے اپنے اس رشتے کا اعلان کرتے ہوئے جو دیہات میں رشتے کے بطور نہیں بلکہ تکیہ کلام کی طرح استعمال ہوتا ہے کہنے لگے ..... دارو غہ بڑا ہی راشی ہے اس نے لوگوں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ چوری کی رپورٹ پر چور پکڑنے کے بجائے رپورٹ کرنے والے کے عزیزوں اور جان پہچان والوں کو پکڑتا ہے۔ اور مال برآمد کرنے کے بجائے بے گناہوں کو مار پیٹ کر رشوت وصول کرتا ہے۔

میں نے کہا کبھی آپ کے یہاں کوئی تھانے دار بطور تبرک بھی ایسا آیا ہے جو چور پکڑتا اور رشوت نہ لیتا ہو۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا ایسا تھانیدار آپ کے یہاں آجائے تو اس کے متعلق مراسلہ ہی نہ بھیجیے گا بلکہ اسکی زیارت کا بھی انتظام کرائیے گا۔

اسکے بعد میں نے سوچا کہ مراسلے کا مضمون زبانی سننے کے بجائے تحریری شکل میں کیوں نہ دیکھ لوں اس طرح میرا وقت بچ جائے گا اور تھانیدار گالیوں سے۔ چنانچہ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا مراسلہ لائے ہیں یا یہاں بیٹھ کر لکھیں گے۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ بعض ایسے کرم فرما بھی آتے ہیں جو مراسلہ کا پورا مضمون زبانی سنانے کے بعد وہیں بیٹھ کر لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم دوات کی فرمائش کرتے ہیں۔ خیر ان مہربان نے یہ تو نہیں کیا۔ مگر یہاں بیٹھ کر مراسلہ لکھنے کے بجائے اسے کھول کر باآواز بلند پڑھنے لگے۔ جس میں تھانے دار کی شکایت کے علاوہ شاید تحریر میں زور پیدا کرنے کے لئے گالیوں کا بے تکلف استعمال بھی تھا اور اسمے وہ اس زور سے سے پڑھ رہے تھے کہ دفتر کے لوگوں کو ان پر تھانے دار کا اور مجھ پر ملزم کا شبہ ہونے لگا۔

میں نے اس خوف سے کہ میری میز کے قریب بھیڑ نہ لگ جائے کہا کہ مراسلہ مجھے دے دیجئے اردو ہی میں تو ہے میں پڑھ لوں گا لیکن دیتے دیتے انھوں نے پورا مراسلہ پڑھ کر سنا ہی دیا۔

اور اچھا بھی ہوا اس لئے کہ وہ لکھا بھی ایسا تھا کہ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لکھیں موسیٰ پڑھیں خدا ——— چلتے چلتے وہ یہ ہدایت بھی کرتے گئے کہ اڈیٹر صاحب ذرا پھڑکتی ہوئی سرخی

لگا دیئے گا۔

میں مراسلہ مع تمہید کے سن چکا تھا اس لئے بغیر دیکھے ہوئے مراسلہ نگار دپ سے نہیں، مراسلوں سے نپٹنے والے اپنے ساتھی کو دے دیا اور کہا کبھئی ذرا سنبھل کر دیکھنا یہ آدمی بگڑے دل ہیں مراسلہ شائع کیا گیا تو مشکل اور نہ شائع کیا گیا تو مشکل۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے ساتھ یہ حضرت ہم لوگوں کو بھی کچہری کی زیارت کرائیں۔

قلت کے کرشمے

جوں جوں غذائی قلت بڑھتی جاتی ہے اسی رفتار سے کھانا کھانے اور کھانا کھلانے والوں کی نیتیں خراب ہوتی جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں جب گیہوں کیلو کے حساب سے نہیں، بوریوں کے حساب سے بکتا تھا تو یہ حال تھا کہ گھر کی دیوار پر کوے کو بیٹھا دیکھ کر باچھیں کھل جاتی تھیں اور اس کے بولتے ہی گھر کے لوگ آنے والے مہمان کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع کر دیتے تھے اور تعلیم کا رواج نہ ہونے کے باوجود اس زمانے میں کوئی مہمان ناخواندہ نظر نہ آتا تھا۔

لیکن اب جبکہ غلہ راشن سے دیا جاتا ہے اور بوریوں کے بجائے لفافوں میں لایا جاتا ہے تو یہ حال ہے کہ لوگ کوے کو اپنے آنگن کی طرف آتے دیکھ کر بڑبڑانے لگتے ہیں کہ کہیں یہ کمبخت کوا کسی مہمان کی خبر بد نہ لا رہا ہو۔ ہندوستان میں خواندگی کی شرح بڑھ جانے کے باوجود غذائی قلت کی وجہ سے ہر آنے والا مہمان ناخواندہ ہی نظر آتا ہے بات یہ ہے کہ جس طرح معاشی ناہمواری کی بناپر جمہوریت بے معنی ہو جاتی ہے اسی طرح خالی پیٹ میں خواندگی کا بھی خیال خام معلوم ہونے لگتا ہے چچا سعدی کو تو صرف یہ تجربہ ہوا تھا کہ قحط میں یار لوگ عشق فراموش کر دیتے ہیں لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ قحط اور قلت غذا کا اثر

دماغ اور اخلاق دونوں پر پڑتا ہے اور لوگ اچھے خاصے پڑھے لکھے مہمان کو صرف ناخواندہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس سے جلد نجات حاصل کرنے کے لیے بے ڈھنگی باتیں کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

پہلے زمانے میں مہمان کو روکنے کے لیے اس کی شیروانی یا اس کا کوئی دوسرا ضروری سامان چھپا کر رکھ دیا جاتا تھا تاکہ وہ جا نہ سکے لیکن اب جانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہی میزبان مہمان کا سارا سامان اس کے تیار ہونے سے پہلے ہی تانگے پر پہونچا دیتا ہے اور اسے رخصت کرنے کے لئے چالیس قدم کے بجائے چار بلاغ تک جاتا ہے اور ریل پر بٹھا کر واپس ہوتا ہے تاکہ مہمان کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ پہونچانے کے لئے اسٹیشن تک جانے میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ مہمان کو جتنی دور تک پہونچانے جاؤ اتنے ہی زیادہ دنوں میں اس کے واپس آنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لئے اب لوگ مہمان کو صرف دروازے تک پہونچا کر لوٹ آنا دور اندیشی کے خلاف سمجھتے ہیں اور دروازے پر "بسلامت روی و باز آئی" کہہ کر واپس نہیں آتے۔ بلکہ جب تک ریل پلیٹ فارم سے باہر نہیں ہو جاتی وہ رومال ہلا ہلا کر مہمان اور مہمان کے تصور کو شہر بدر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور گھر واپس آکر اپنے عزیز کی اتنی جلد جدائی پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور بیگم سے کہتے ہیں کہ اب تو شاید صرف شکر ہی بازار سے لانا پڑے گیہوں آخر ماہ تک چل جائیں گے۔ لیکن بیگم کی بات سن کر ان کے حواس گم ہو جاتے ہیں کیوں کہ بیگم گیہوں کا خالی پیپا سامنے کھسکا کر کہتی ہیں ابھی شیروانی نہ اتاریئے لگے ہاتھوں بازار سے گیہوں لیتے آیئے ورنہ دیر ہو گئی تو پن چکی سے آٹا پس کر نہ آسکے گا اور شام کو فاقہ ہی کرنا پڑے گا۔ وہ وقت سے ہمسائی سے آٹا مانگ مانگ

کر کام چلا رہی ہوں اب مانگنے گئی تو لکا سا جواب مل جائے گا۔ کیا ان بیچاری کے یہاں گیہوں کی کاشت ہوتی ہے جو محلے والوں میں بانٹا کریں انھیں بھی تو آخر اسی راشن میں کام چلانا ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے گھر کی طرح ان کا گھر مہمان خانہ نہیں ہے ایرے غیرے نتھو خیرے جسے دیکھیے بستر باندھے چلے آ رہے ہیں۔

بیگم کی یہ تقریر دل پذیر سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ اور میں نے اپنا سر پکڑ کر کہا کہ بیگم یہ تم کیا کہہ رہی ہو یہ میرے خالہ زاد بھائی جو برسوں کے بعد دو دن کے لیے آئے تھے وہ ایرے غیرے ہو گئے۔ راشن کا امریکی گیہوں کھانے سے معدہ خراب ہوتے سنا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے کھانے سے خون سفید ہو جاتا ہے۔

یہ سننا تھا کہ بیگم نے گھر سر پر اٹھا لیا اور مجھے منہ کھولنے تک کا موقع نہ دیا۔ قہر درویش بر جان درویش حالات کا اندازہ کر کے خاموش ہو رہا۔

بات یہ ہے کہ ہم گھریلو زندگی میں پر امن بقائے باہم کے قائل ہیں اس لئے بیگم کی جانب سے اعلان جنگ کے باوجود ہم میدان میں اترنے کے بجائے اپنے ہمسایہ کے یہاں چلے گئے۔ اور ان کی ثالثی کی خدمات حاصل کر کے جنگ بندی کے لئے زمین ہموار کرنے لگے۔

غذائی قلت کا اثر شادی بیاہ کی تقریبات پر بھی پڑا ہے پہلے زمانے میں تیل، مین، خدا را سعہ سے لے کر دعوت ولیمہ اور چوتھی چالوں کو ملا کر لگ بھگ ایک ماہ کا پروگرام ہو جاتا تھا۔ قریب کے عزیزوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تو شادی سے ایک مہینے پہلے اور ایک مہینے بعد تک جاری رہتا تھا میراثنیں بات چیت کی سن گن پاتے ہی ڈھولک سنبھال کر مبارک باد دینے پہونچ

جاتی تھیں نا دنیں کام کاج کے لئے۔ خود ہی پہلے سے بلالی جاتی تھیں اور جہاں بجی ڈھول وہاں کھڑے نخلال قسم کے دو چار بھان بن بلائے ڈھول کی آواز کو دعوت عام سمجھ کر لگ لیتے تھے۔ غرض شادی سے مہینوں پہلے گھروں میں شادی جیسی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔

لیکن جوں جوں گیہوں کی گرانی بڑھتی گئی توں توں شادی کی تقریبات کا دامن تنگ ہوتا گیا، تیل، مین کی تقریبوں کو آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر ان سے پیچھا چھڑا لیا گیا۔ بڑھتی ہوئی گرانی سے دن ہی میں تارے نظر آنے لگے اس لئے خذارات خود ہی غائب ہو گئیں۔ لیکن برات سے نجات کی کوئی راہ نہ تھی اس لئے برات آتی تو ہے لیکن برائے نام راشن میں کمی کے ساتھ ساتھ اب براتیوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے صرف دولھا میاں اور ان کے چند دوستوں اور عزیزوں تک محدود ہو گئی ہے بعض سمجھدار لڑکے اور لڑکی تو ماں باپ کو زیر باری سے بچانے کے لئے گھر کے بجائے کچہری ہی میں اس فرض کو انجام دینے لگے ہیں۔ اور اب وہ دن دور نہیں جب ایجاب و قبول ٹیلی فون کے ذریعہ گھر بیٹھے ہی ہو جایا کرے گا نہ تو برات آئے گی اور نہ براتی۔

آج کل برات بلائیے تو براتیوں کو کھلانے کا انتظام کیسے ہو۔ اگر چوری چھپے آپ نے دیگیں چڑھوا بھی دیں تو اس کا پورا خطرہ ہے کہ پلاؤ زردہ تیار ہونے سے پہلے پولیس والے آپ کو حوالات میں لے جانے کی تیاری شروع کر دیں۔ اور لڑکی کی رخصتی کے بجائے آپ کی رخصتی کی دھوم دھام مچ جائے۔

غذائی قلت کی کرشمہ سازی سے وہ لمبی براتیں جن کا ایک سرا اگر دلھن کے دروازے پر ہوتا تھا تو دوسرا سرا دولھا کے پھاٹک پر اور وہ برات ہیں کسی کی زلف دراز معلوم ہوتی تھیں اب اتنی مختصر ہو گئی ہیں کہ ان پر یونی ٹیل کا

مشتبہ ہونے لگتا ہے۔ یہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں نے براتیوں کی صرف تعداد ہی کم کردی ہو بلکہ برات کے قیام کی مدت بھی اتنی مختصر کردی ہے کہ بچارے براتی اچھی طرح گردِ سفر جھاڑنے بھی نہیں پاتے کہ رخصتی کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں پہلے زمانے میں براتی کھانا کھاتے بھی تھے اور ناشتے کے لیے باندھ بھی لے جاتے تھے۔ شاید اسی ڈر سے اب براتیوں کو صرف ناشتہ کرایا جاتا ہے اور کھانا کھانے کے لئے انھیں فوراً گھر واپس آنا پڑتا ہے۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ غذائی قلت نے صرف لڑکی والوں ہی کو کفایت پر مجبور کیا ہے بلکہ لڑکے والوں نے بھی دعوت ولیمہ کے اخراجات کم کرنے کی نئی نئی ترکیبیں نکال لی ہیں بعض تو اپنے مہمانوں کا بار بھی لڑکی والوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور دعوت ولیمہ میں مدعو کرنے کے بجائے صرف برات میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اگر کسی دباؤ سے دعوت ولیمہ دینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں تو ایٹ ہوم کے نام سے مرعوب کرکے صرف چائے بسکٹ پر ٹرخا دیتے ہیں۔ بعض زیادہ سمجھ دار لوگوں نے ایک نئی ترکیب نکالی ہے وہ ہے بوفے سسٹم جس میں مہمانوں کو کھڑے کھڑے کھانے کی سزا دی جاتی ہے اور جس کا مقصد دعوت دینا نہیں ہوتا بلکہ بڑی چال کر مہمانوں کو لڑانا ہوتا ہے۔ اس دعوت میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون چلتا ہے۔ اور میدان یاران تیز دست کے ہاتھوں میں رہتا ہے وہ اپنا ہی حصّہ نہیں بلکہ دوسروں کے حصّے بھی اپنا ہی حصّہ سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔

اس دعوت کی خوبی یہ ہے کہ آپ مختصر سے سامان پر لامحدود مہمانوں کو مدعو کرسکتے ہیں۔ اس میں کھانے والے اور نہ کھانے والے دونوں دعوت میں برابر کے شریک سمجھے جاتے ہیں اور کسی کو شکایت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی یہ دعوت بالکل

فری کمپیٹیشن (آزاد مقابلہ) کے اصول پر ہوتی رہے جس میں زوردار اور کمزور مہمانوں کو ایک میز پر بیٹھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے جس کا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو تجارت میں فری کمپیٹیشن سے نکلتا ہے۔ یعنی بڑے تاجر آزاد تجارت کا نعرہ لگا کر چھوٹے تاجروں کو ہضم کر جاتے ہیں۔ آزاد تجارت اور آزاد دعوت (بوفے) میں فرق صرف یہ ہے کہ زوردار مہمان کمزور مہمانوں کو کھا نہیں جاتے بلکہ اپنی درازدستی سے انھیں کونے میں کھڑے ہو کر خاموشی سے اس شعر کی تلاوت پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ؎

یہ بوفے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں کھانا اسی کا ہے

روزہ خوری

بعض لوگ روزہ نہ رکھنے کے باوجود افطار و سحر بڑی پابندی سے کرتے ہیں اور جس طرح اس نئے دور میں محاذِ جنگ پر لڑنے والے ہی نہیں بلکہ کھیت اور کارخانوں میں کام کرنے والے بھی جنگ میں شریک خیال کئے جاتے ہیں اسی طرح سحر و افطار میں شریک ہونے والے بے روزہ اپنے کو پورا نہیں تو نصف روزہ دار ضرور خیال کرتے ہیں اور نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان کی طرح یہ نیم روزہ دار روزہ داروں کیلئے آفت جاں بنے رہتے ہیں اور افطار کے وقت آستینیں چڑھا کر دسترخوان پر پہنچنے ہی سے اس طرح ڈٹ جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بلا سحر کے روزہ رکھا ہے حالانکہ دن بھر بکری کی طرح منہ چلایا کرتے ہیں اور کھانے کے ساتھ روزہ بھی ہضم کر جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے روزے کے معاملہ میں ہمارا رویہ بقائے باہم کا ہے اور ہم دن میں کسی روزہ دار کے سامنے کھانا پینا اتنی ہی بڑی بد اخلاقی خیال کرتے ہیں جتنی کہ شام کو افطار میں شرکت نہ کرنا۔ ہم میں اور روزہ دار میں بس فرق صرف یہ ہے کہ ہم دن میں بچا کھچا چھپا کر کھاتے ہیں اور روزہ دار سحر و شام کو علی الاعلان بڑے اہتمام سے کھاتے ہیں۔

ہم اس سلسلہ میں یہ احتیاط بھی برتتے ہیں کہ روزہ نہ رکھنے کے باوجود ہم

روزہ داروں جیسا منہ ضرور بنائے رہیں۔ دراصل ہم ملا عذر شرعی روزہ ترک بھی نہیں کرتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری دائم المریضی کی بنا پر لوگ اسے عذر شرعی کے بجائے عذر لنگ خیال کرتے ہیں۔

مسجد سے قریبی تعلق رکھنے والے ان حلقوں سے جو رمضان شریف میں چاہے کسی عذر شرعی کی بنا پر روزہ ترک کر دیں لیکن مغرب کی نماز مسجد میں جا کر باجماعت پڑھتے اور روزہ داروں کے ساتھ افطار میں شرکت کی سعادت ضرور حاصل کرتے ہیں معلوم ہوا ہے کہ غذائی قلت کا اثر صرف بازار میں غلہ کی درآمد ہی پر نہیں بلکہ مسجد میں افطار کی آمد پر بھی پڑا ہے جن گھروں سے بلاناغہ بڑے اہتمام سے کشتیوں میں افطار کا سامان آتا تھا اب تشتریوں میں گنڈے دار روزوں کی طرح ایک دن چھوڑ کر آنے لگا ہے۔

سو گھر بیویوں کا کہنا ہے کہ پہلے گھر میں چراغ جلایا جاتا ہے پھر مسجد میں جب گھر میں چراغ جلانے کے لیے مٹی کا تیل میسر نہیں تو مسجد میں افطار کا سامان بھیجنے کے لیے سرسوں کا تیل کہاں سے آئے۔ چنانچہ جس طرح غلہ کی قلت کی وجہ سے بازار سونے پڑے ہیں اسی طرح افطار کی کمی کی وجہ سے مغرب کے وقت مسجدوں کی چہل پہل میں خاصی کمی ہو گئی ہے۔

سوکھی سحری اور سوکھی افطاری کی وجہ سے بعض شوقین روزہ داروں کا تو بالکل موڈ ہی خراب گیا ہے ان کا کہنا ہے کہ روزے کی شان تو افطار و سحر کی سجاوٹ میں ہے بے لچھے، ڈبل روٹی اور سوجی کے سحر کے وقت روکھی پھیکی چائے کے گھونٹ زبردستی حلق سے اتار کر روزہ رکھنا سحری کو منہ چڑھانا ہے سحر کا لطف تو جب ہے کہ دو بجے سے ذکر اذان کے وقت تک کھانے پینے کی دھوم دھام سے اور سحر کے اہتمام سے گھر میں غذاؤں کا سامان پیدا ہو جائے۔ اسی طرح دن ڈھلتے ہی

افطار کی تیاری اس زور وشور سے ہو کہ محلہ والوں کو شبہ ہونے لگے کہ گھر پہ بارات آنے والی ہے۔

لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ گرانی کا اثر سحر و افطار کے سامان پر خاص طور پر پڑا ہے سحر کے لئے ڈبل روٹی ایک تو ملتی ہی بڑی مشکل سے ہے اور اگر وہ ڈھوپ اور خوشامد درآمد سے مل بھی گئی تو دوگنے داموں پر یہی حال کھیّے اور سوجی اور سویوں کا ہے۔ اب رہا افطار کا سوبین کی کمیابی اور کڑوے تیل کی گرانی کی وجہ سے بالکل چوپٹ ہو گیا۔ یہ بھی کوئی افطار ہے جس میں نہ پھلکیاں ہوں نہ دہی بڑے، نہ بھنگنی ہو اور نہ چنے کی دال، بے سحر و افطار کا روزہ تو بالکل بے نمازی کا روزہ ہے جسے فاقہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

کراماً کاتبین کے رجسٹر سے پتہ چلتا ہے کہ اس پچھلے روزے سے روزہ خوروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور یہ اضافہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ہوا ہے درویش بگردنِ راوی۔ ایک پاکستانی دوست نے ہمیں بتایا کہ وہاں روزہ کا اتنا نہیں۔ جتنا افطار پارٹی کا رواج ہے۔ ہر کھاتے پیتے گھرانے میں رمضان شریف کے زمانے میں ایک آدھ مرتبہ افطار پارٹی کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے چنانچہ ایک جگہ سے ہمارے دوست کو بھی افطار پارٹی میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں سوئے ہضم کی شکایت کی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کا عذر شرعی حاصل تھا لیکن احتراماً وہ روزہ داروں جیسا منہ بنائے ہوئے افطار پارٹی میں شرکت کے لئے گئے، لیکن اس خیال سے کہ روزہ داروں کا مجمع ہو گا کچھ سہمے سہمے تھے۔ اس لئے ٹھیک افطار کے وقت پہنچے لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں بھی بظاہر روزہ داروں میں صرف دو بوڑھے نوکر تھے جو افطار پارٹی میں شرکت کرنے والے بے روزہ داروں کے سامنے مینول

پر افطار کا سامان بڑی مستعدی سے سجا رہے تھے۔ اور جلدی جلدی کھجور سے روزہ کھول رہے تھے۔

حکیم کھریا

ہمارے ایک حکیم صاحب ہیں جنھیں لوگ عام طور پر حکیم کھریا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صحیح علاج دوا اور دعا دونوں کے معجون مرکب ہی سے ہو سکتا ہے چنانچہ وہ نسخہ کے بجائے تعویذ لکھتے ہیں اور دوا اپنے پاس سے دیتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھ ماہ سے زیادہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکتے اور مریضوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے خود ان کی دست رس سے باہر ہو جاتے ہیں۔

وہ اپنے زیر علاج مریضوں کو تعویذ کے ساتھ جو دوا دیتے ہیں وہ عام طور پر سفوف ہوتا ہے جو تعویذ کی طرح چھوٹی سی پڑیا میں لپٹا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ سفید اور مزا میٹھا ہوتا ہے۔ اللہ اندھے اعتقاد کو سلامت رکھے اگر مریض پہلا تعویذ باندھ کر اور میٹھا سفوف کھا کر اچھا ہو گیا تو ظاہر ہے کہ نہ تو دوسرا تعویذ لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ دوسرا سفوف دینے کی۔ ہاں اگر مریض بد عقیدہ ہوا اور پہلے تعویذ اور پہلے سفوف سے متاثر نہ ہوا تو وہ دوسرا تعویذ باندھنے کے لئے اور دوسرا سفوف کھانے کے لئے دیتے ہیں۔ یہ دوسرا سفوف نمکین اور اس کا رنگ لال ہوتا ہے۔ چونکہ تعویذ مفت اور دوا سستی ہوتی ہے اس لئے ہمارے حکیم صاحب جس گاؤں میں اپنا مطب جماتے ہیں چند ہی دنوں

میں چمک اٹھتا ہے اور لوگ پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مریضوں کا اتنا ہجوم ہوجاتا ہے کہ مطب میں تعویذ لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی اس لئے وہ تعویذ اور سفوف کی پڑیا پہلے ہی سے تیار رکھتے ہیں ایک ہاتھ سے نبض دیکھتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے تعویذ اور پڑیا مریضوں کو تقسیم کرتے جاتے اور ہدایت کرتے جاتے ہیں کہ تعویذ کپڑے میں لپیٹ کر باندھو اور دوا آنکھ بند کرکے کھاؤ اس لئے سوائے ہم جیسے بدعقیدہ لوگوں کے آج تک نہ تو کسی مریض نے ان کا تعویذ پڑھا اور نہ دوا دیکھی یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو یہ راز معلوم ہوسکا کہ حکیم صاحب نہ تو تعویذ لکھنا جانتے ہیں اور نہ دوا بنانا۔

یوں تو میں حکیم کھربا سے عرصہ سے واقف ہوں لیکن ایک مرتبہ میری ان کی ملاقات عجیب وغریب حالات میں ہوئی۔ میں اپنے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کی غرض سے اسٹیشن سے اتر کر ایک گاؤں سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں میں بھاگ دوڑ مچی ہے اور ایک طرف سے 'بچاؤ بچاؤ' کی دردناک صدائیں آرہی ہیں۔ چوں کہ میرا راستہ اسی طرف جاتا تھا اس لئے جب میں وہاں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ بری طرح پٹ رہے ہیں کچھ لوگ بچا بھی رہے ہیں لیکن مارنے والوں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوت سوار ہے کہ وہ کسی کی کوئی بات سنتے ہی نہ تھے اور برابر مارے جارہے تھے۔

میں کوٹ پتلون پہنے اور اتفاق سے ہیٹ بھی لگائے ہوئے تھا میرے ذہن میں بجلی کی طرح ان بزرگ کو بچانے کی ایک ترکیب کوندگئی اور میں نے دور ہی سے ڈپٹ کر کہا کہ ایک ایک کو باندھ کر بھیج دوں گا۔ یہ سنتے ہی پیٹنے والے چوکنا اور بچانے والے مجھ سے فریاد کرنے لگے۔ اور حکیم صاحب کی پٹائی سے فراغت کے بعد مارنے والے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے میری طرف

بڑھے میں نے کہا کہ تم لوگ ان بچارے بزرگ کو بے قصور کیوں مار رہے ہو؟

انھوں نے اس کے جواب میں کہا حضور! یہ بزرگ نہیں بے ایمان ہے۔

میں نے پوچھا کہ انھوں نے تمھارے ساتھ کیا بے ایمانی کی۔ ان میں سے ایک شخص جو کچھ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا اس نے کہا کہ آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے تو ہم آپ کو ان کے کرتوت بتائیں۔

میں کیکر کے نیچے پڑے ہوئے ایک پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس شخص نے اپنی درد بھری داستان یوں بیان کرنی شروع کر دی۔

یہ حکیم صاحب ہمارے گاؤں کے پاس ایک گاؤں میں آئے، یہ دوا کے ساتھ جھاڑ پھونک بھی کرتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے بھائی کی گھر والی پر پیپل والے پریت کا سایہ پڑ گیا تھا اور وہ اسے بہت ہلکان کئے ہوئے تھا۔ ہم نے جب حکیم صاحب کا نام سنا تو ہم بہو کو لے کر ان کے پاس گئے اور سارا حال بتایا۔ حکیم صاحب نے ہماری ڈھارس بندھائی اور کہا کہ اطمینان رکھو پریت اس کے سر ہی سے نہیں پیپل چھوڑ کر نہ بھاگ جائے تو میرا ذمہ مگر ہے بڑا سخت جان اس کے جلانے میں کافی محنت کرنی پڑے گی۔

ہم لوگوں نے کہا کہ حکیم صاحب ہم آپ کے بڑے احسان مند ہوں گے اور آپ کی جو خدمت ہو سکے گی کریں گے لیکن آپ ہم کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا دیجئے۔ آخر طے ہوا کہ حکیم صاحب دو سو روپیوں میں بھوت بھگا دیں گے چنانچہ سو روپے بھوت بھگانے سے پہلے اور سو روپے بھگانے کے بعد دینا طے پایا۔ ہم لوگوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر اور قرض عام لے کر سو روپے لا کر حکیم صاحب کو دیدیئے حکیم صاحب نے جھاڑ پھونک شروع کی اور منگل کے دن بھوت جلانے کے لئے بہو کو اپنے گھر بلایا۔

حکیم صاحب کے سامنے انگیٹھی پر ایک کوری ہانڈی رکھی تھی اور اس پر ڈھکن بند تھا اور اسے آٹا لگا کر کس دیا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے ہم کو بتایا کہ وہ بڑی مشکل سے پیپل والے پریت کو اس ہانڈی میں بند کر پائے ہیں اور اب وہ اسے جلانے جا رہے ہیں۔

انھوں نے ایک طرف انگیٹھی میں آگ لگا دی دوسری طرف انھوں نے منتر پڑھنے شروع کر دیئے وہ جوں جوں منتر پڑھتے جاتے توں توں ہانڈی ہلتی جاتی۔ اور ایک مرتبہ تو ایسا معلوم ہوا کہ پریت ہانڈی سمیت اڑ جائے گا لیکن حکیم صاحب نے لپک کر اپنے ڈنڈے سے ہانڈی کے ڈھکن کو دبا دیا اور خوب زور زور سے منتر پڑھنے لگے اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ تیز آنچ کے باوجود ہانڈی کا ہلنا جلنا بالکل بند ہو گیا اور ہم کو یقین ہو گیا کہ پیپل کا پریت حکیم صاحب کی کرامات سے سدا کے لئے بھسم ہو گیا۔ اور ہم خوشی خوشی گھر لوٹ آئے اور بقیہ سو روپیوں کا انتظام کرنے لگے ابھی ہم پورے روپیوں کا انتظام کر بھی نہ پائے تھے کہ بہو پر پھر بھوت سوار ہو گیا اور اس نے جھومنا اور سر ٹکرانا شروع کر دیا۔

ہم اسے لے کر حکیم صاحب کے پاس آئے تو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب بھوت بھگا کر خود بھی اسی کے ساتھ بھاگ گئے۔ لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکیم صاحب بزرگ نہیں چار سو بیس ہیں اور انھوں نے اس ہانڈی میں پیپل کے پریت کے بجائے تالاب کے مینڈک بند کر رکھے تھے جو آگ کی گرمی سے پہلے خوب اچھلے کودے اس کے بعد زیادہ آنچ سے جل کر راکھ ہو گئے۔ اس طرح حکیم صاحب نے مینڈک جلا کر ہم سے پریت جلانے کے پیسے وصول کئے۔

میں نے کہا اب کیا ارادہ ہے؟ حکیم صاحب تو بہو کا بھوت اتار نہ سکے لیکن تم لوگوں نے ان کے سر کا بھوت ضرور اتار دیا۔ اب کیا تم اُن سے بھوت

اتروائی کی فیس لینا چاہتے ہو۔

انھوں نے کہا کہ حضور ہم نہ حکیم ہیں اور نہ بزرگ، جو مرض دور کریں یا بھوت اتاریں ہم تو اپنی گاڑھی کمائی کے سو روپے وصول کرنے آئے تھے جو حکیم صاحب بغیر ڈکار لئے ہضم کر جانا چاہتے تھے سو ہم نے دہ روپے مع سود وصول کر لئے۔

میں نے تعجب سے کہا واقعی ؟ اگر ایسا کیا تو کمال ہی کر دیا انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب نے ہماری جیب سے سو لئے تھے ہم نے ان کے سر پر گن کر سوا سو لگا لئے اس طرح ہمارا ان کا حساب مع سود بے باق ہو گیا۔ یہ کہہ کر وہ لوگ روانہ ہو گئے اور حکیم صاحب کے جب حواس بجا ہوئے اور انھوں نے مجھے پہچانا تو وہ بھی کھسکنے کے لئے پر تولنے لگے۔

میں نے بے تکلفی سے حکیم صاحب سے علیک سلیک کی اور کہا کہ آپ کی طبیعت اس ناخوشگوار واقعہ سے کافی بدمزہ ہو گئی ہے آیئے میرے ساتھ چلیئے اور شادی میں شریک ہو کر بدمزگی بھی دور کیجیئے اور دعوت بھی کھایئے۔ حکیم صاحب کچھ تکلف کے بعد میرے نیک مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے اب حکیم صاحب ہمارے ساتھ بھوت اتارنے نہیں بلکہ اپنا تکان دور کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

وہ گاؤں جہاں مجھے جانا تھا کچھ زیادہ دور نہ تھا اور جلد ہی ہم لوگ منزلِ مقصود پر پہونچ گئے۔ حسنِ اتفاق دیکھیئے کہ ہم جس وقت پہونچے تو دستر خوان بچھایا جا رہا تھا اس لئے میزبان صاحب ایک کر ہاتھ ملانے کے بجائے ہاتھ دھلانے لگے اور ہم دونوں قبل از طعام بعد از کلام پر عمل کرتے ہوئے خیریت خیر سلا پوچھنے سے پہلے کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔

کھانے کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک صاحب جو دستر خوان پر دوسری طرف کونے میں بیٹھے تھے وہ کنکھیوں سے بار بار حکیم صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے دل میں کہا اللہ خیر کرے کچھ دال میں کالا نظر آرہا ہے حکیم صاحب کھانے میں اس خشوع وخضوع سے مصروف تھے کہ ان کی نظر ان صاحب پر نہیں پڑی اور وہ آخر وقت تک مزے لے لے کر کھاتے رہے۔ لیکن اُن صاحب کی مشتبہ تانک جھانک سے میرا کھانا حرام ہو گیا اور کھانے کے بجائے میں جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا وظیفہ پڑھتا رہا۔

کھانے کے بعد میں ابھی ہاتھ دھو کر منہ پونچھ ہی رہا تھا کہ حکیم صاحب پان اور سگریٹ کی کشتی کی طرف جھپٹے اور اسی کے ساتھ میں نے دیکھا کہ وہ صاحب جو انھیں دسترخوان پر کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ جھپٹ کر ان کے پاس آ گئے۔ اور ان کو دیکھتے ہی حکیم صاحب ایسے دبک گئے جیسے باز کے جھپٹنے پر چڑیا دبک جاتی ہے۔ پان کی پیک حلق میں پھنس کر رہ گئی اور ہاتھ کا سگریٹ زمین پر گر گیا۔ میں نے معاملہ کی نزاکت فوراً محسوس کر لی اور حکیم کے ساتھ اپنی عزت آبرو خطرے میں دیکھ کر میں نے بڑی لجاجت سے ان صاحب سے درخواست کی کہ وہ چند منٹ کے لئے میرے ساتھ شامیانے کے باہر چلے آئیں وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے راضی تو ہو گئے لیکن اس شرط سے کہ میں اپنے ساتھ حکیم صاحب کو بھی لے چلوں۔

چنانچہ ہم تینوں شامیانے کے باہر بجنے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور ان صاحب نے کہنا شروع کیا کہ حکیم صاحب بڑی خوشی کی بات ہے آپ سے نیاز حاصل ہو گیا کیونکہ مجھے آپ سے اس مریض کا حال کہنا تھا جسے آپ ملک الموت کے سپرد کر کے خود غائب ہو گئے تھے چنانچہ مریض موت آتی ہے پر نہیں آتی کی حالت میں گھنٹوں تڑپتا رہا اور جب اسپتال لایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ بھگتان اسے آپ کی سفید اور لال پڑیا آنکھ بند کر کے کھانے کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔

اسپتال کے لوگوں نے آپ کی سفید اور لال دونوں پڑیاں ہم سے مانگ کر دیکھیں اور جانچ کر کے یہ بتایا کہ سفید پڑیا شکر ملا ہوا کھریا مٹی کا سفوف ہے اور لال پڑیا نمک ملا ہوا کھوری اینٹ کا سفوف۔

ابھی وہ آگے کچھ کہنے بھی نہیں پائے تھے کہ میں نے مریض کی خیریت دریافت کی اور امید ظاہر کی کہ اب وہ تندرست ہوں گے۔

اس پر انھوں نے کہا کہ حکیم صاحب نے مریض کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی لیکن جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے ہم لوگ بروقت چونک پڑے اور حکیم صاحب کی پڑیوں کے چکر سے نکل کر اسپتال پہونچ گئے ورنہ بچارے مریض پر نہ جانے کیا بیت جاتی۔

لیکن باتوں کے بعد جب ہم لوگ چونکے تو ہم نے دیکھا کہ حکیم صاحب غائب تھے اور اپنے بجائے مجھے پٹائی کے لئے چھوڑ گئے تھے۔

مفلسی میں آٹا گیلا

میں نے کہا کہ مرزا صاحب خیریت تو ہے۔ بہت دنوں کے بعد نیاز حاصل ہوا۔ آپ تو عید کے چاند ہو گئے، دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔

مرزا۔ اماں۔ تم بھی کیا مذاق کرتے ہو۔ آج کل اور خیریت! یونہی گرانی سے گلے میں پھانسی لگی ہوئی تھی اب جو سوکھا پڑ رہا ہے اس سے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں ترلوک نظر آجائیں گے۔ خریف کی فصل تو خیر خراب ہو ہی گئی۔ اگر کالے میگھا ایک آدھ ہفتے اور یونہی کترا کے نکل گئے تو سمجھئے خریف کے ساتھ ربیع بھی چوپٹ ہوئی۔

میں۔ تو یہ کہئے! آج صبح صبح آپ نہار منہ کالے میگھا کی تلاش میں نکلے ہیں۔

مرزا۔ جی نہیں! کالے میگھا کی تلاش میں نہیں نکلا ہوں بلکہ ان کرم فرما کی تلاش میں نکلا ہوں جو کل مفلسی میں آٹا گیلا کر کے اس طرح غائب ہو گئے جس طرح آج کل آسمان سے بادل غائب ہو گئے ہیں۔

میں۔ تو پھر آپ ان کو یہاں بلا وجہ تلاش کر رہے ہیں وہ تو کہیں ہوا کے دوش پہ سوار سے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

کا گیت گاتے اڑے چلے جا رہے ہوں گے۔ رہی آٹا گیلا ہونے کی بات تو

آپ بڑے بھاگوان ہیں کہ آپ کے یہاں مہینے کے آخر میں اتنا آٹا تو ہے کہ گیلا ہو سکے۔ یہاں یہ حال ہے کہ بیگم تین دن سے محلے بھر کے گھروں کی بچوں کے ذریعہ تلاشی لیوا کر آٹا برآمد کرا رہی ہیں لیکن پھر بھی اتنا آٹا برآمد نہ ہوا کہ گیلا ہو سکے۔ کیوں کہ جہاں جائے بھوکا وہاں پڑے سوکھا تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جس طرح زر میں زر ملتا ہے اسی طرح اگر آپ کے یہاں آٹا ہو تو محلے میں بھی آٹا مل جاتا ہے۔ ورنہ

ڈھونڈنے جاؤں تو آٹا مجھے نایاب ملے

والا مضمون ہوتا ہے۔

مگر یہ تو بتائیے! مرزا صاحب! وہ کون سے کرم فرما تھے کہ انھیں ساہوکاروں اور بنیوں کے بڑے گوداموں کا آٹا گیلا کرنے کے بجائے آپ کے یہاں کی چھوٹی سی لگن کا آٹا گیلا کرنے کی سوجھی جہاں پانی کی زیادتی اور آٹے کی کمی سے یوں ہی اکثر آٹا گیلا ہو جایا کرتا ہے۔

مرزا۔ ارے بھئی! اگر میں ان کرم فرما سے واقف ہوتا تو ان کی تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھانتا کیوں پھرتا۔

میں۔ مرزا صاحب! گستاخی معاف! اس وقت میرے ذہن میں ایک منطقی سوال بری طرح کروٹیں لے رہا ہے اگر جان بخشی ہو تو پوچھ لوں؟

مرزا۔ ضرور پوچھو اور جلد پوچھو کیونکہ اگر تم نے دیر کی تو خطرہ ہے کہ وہ کہیں کروٹیں لینے کے بجائے ڈنڈا لے کر اٹھ کھڑا نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ جس طرح پانی رکے رہنے سے گندہ ہو جاتا ہے اس طرح سوالات کے رکے رہنے سے دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ نہ تو کارپوریشن پانی کی نکاسی کے لئے نالیوں کا اچھا انتظام کرتی ہے اور نہ حکومتیں

سوالات کے سامنے آنے کے لئے مناسب احول فراہم کرتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانی گندہ اور دماغ پراگندہ ہو رہے ہیں اچھا! بتاؤ وہ کونسا سوال ہے جو عاشق ناشاد کی طرح چارپائی پر نہیں تمہارے دماغ میں بےچینی سے کروٹیں بدل رہا ہے۔

میں۔ مرزا صاحب! سوال تو معمولی ہے لیکن ہے بالکل منطقی، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کے یہاں آٹا تھا ہی نہیں تو گیلا کیونکر ہوا۔

مرزا۔ صدقے جاؤں تری زبان دانی کے ارے بھائی! مفلسی میں آٹا گیلا ہونے کے لئے آٹا ہونا نہیں، آٹا نہ ہونا ضروری ہے۔

میں۔ اچھا بتایئے کہ وہ کرم فرما آٹا گیلا کرنے میں کامیاب کیسے ہوئے؟

بھئی! ہوا یہ کہ میں گھر سے گیہوں خریدنے کی نیت سے نکلا دھوپ سخت تھی اور طبیعت پژمردہ۔ گیہوں کا بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب گیہوں جنت کے سوا دنیا میں کھانے کو نصیب نہ ہوگا۔ لیکن جنت کا گیہوں کھانے کا خیال آتے ہی بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ساتویں آسمان سے نیچے پھینک رہا ہے۔ اور میں نے ڈر کر گیہوں کے اس ڈھیر سے نظریں پھیر لیں جو میرے سامنے تو تھا لیکن اس میں ہاتھ لگانا میرے بس میں نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اب خالی ہاتھ گھر کیا جاؤں اس لیے جو پیسے تھے ان کا آٹا اور متفرق چیزیں خرید لیں اور مزدور کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ یہ کرم فرما ایک جھولے میں گیہوں لیے میرے پاس سے گزرے اور دو قدم آگے بڑھنے کے بعد پھر میری طرف مڑے اور نہایت ہمدردی سے کہا کہ بڑے صاحب اچھے گیہوں خریدنے ہوں تو یہاں نہیں پرلی طرف نکڑ والی دوکان سے خریدیئے۔ دیکھئے نا گیہوں صاف بھی ہیں اور سستے بھی اور انھوں نے جھولے سے ایک مٹھی گیہوں نکال کر میری

طرف بڑھائے گیہوں واقعی اچھے تھے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولے کہتے خریدنے ہیں میں نے کہا ابھی پرتے سے مل جائیں تو من ڈیڑھ من خریدے جاسکتے ہیں۔ مگر روپئے ..... ابھی میں پورا جملہ بھی نہ کہہ پایا تھا کہ وہ بول اٹھے بڑے صاحب اس کی فکر نہ کیجئے میں منٹوں میں روپئے لادوں گا آپ نقن صاحب والے مکان کے برابر رضوی صاحب کے گھر کے سامنے ہی تو رہتے ہیں امی جان کو ایک پرچہ لکھ دیجئے میں ابھی لایا دیر ہوئی تو سب بک جائیں گے۔ ایسا سستا اور صاف گیہوں ملنا مشکل ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا جھولا میرے پاس رکھ دیا اور پنسل اور کاغذ جیب سے نکال کر میری طرف اس خلوص سے بڑھایا کہ مجھے ان کے خلوص پر شبہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی اور میں نے پرچہ لکھ کر دے دیا اور وہ بیگم سے ۵۰ روپئے اور دو چادریں لے کر شاید سستے گیہوں کی تلاش میں شہر باہر چلے گئے۔

بار بار برے خیالات ذہن میں آتے لیکن ان کی معصوم صورت اور پرخلوص لہجہ سامنے آکر میری بدگمانی پر مسکرانے لگتا اور میں شرمندہ ہو کر لاحول پڑھنے لگتا جب بہت دیر ہوگئی تو قوت برداشت کم اور بدگمانی زیادہ ہونے لگی اور میں ان کا انتظار کرنے کے بجائے روانگی کے لئے مزدور تلاش کرنے لگا اور جب میں نے گھر ہو کر بیگم کے سامنے من بھر گیہوں کے بجائے جھولا بھر گیہوں رکھے تو وہ مجھے اس طرح مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے میں نے پچاس روپئے کا جوا کھیل ڈالا۔ اب بیگم گھر میں بیٹھنا مشکل کئے ہوئے ہیں اور میں ۵۰ روپئے گنوانے کے بعد گلی کوچوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔

میں نے کہا مرزا صاحب میری رائے یہ ہے کہ آپ بیگم کو منانے کے لیے کہیں سے ۵۰ روپئے قرض لا کر دیدیجئے۔ اس سے آپ کی سمجھداری کی ساکھ بھی باقی رہے گی اور آپ اس سزا سے بھی نجات پا جائیں گے۔ جو آپ کو ان کرم فرما کی تلاش میں

بھگتنی پڑ رہی ہے جن کا ملنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ آجکل سستے گیہوں کا ملنا مشکل۔

اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں آپ کی تسکین کے لیے اپنی آپ بیتی بھی سنا دوں جو ممکن ہے انہی کرم فرما کی دین ہو جو آپ کو دغا دے کر داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ یہ سن کر مرزا صاحب کے منہ سے ایسا معلوم ہوا جیسے کہ کہہ رہوں کہ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

میں مرغ قبلہ نما تو نہیں لیکن اس ناوک ناز کا صید ضرور ہوں جس کے ایک چرکے سے مرزا صاحب مرغ قبلہ نما کی طرح آشیانے میں نہیں محلے بھر میں تڑپتے پھر رہے ہیں۔

شامت اعمال ہوا یہ کہ دیہات سے کچھ مہمان آ گئے پہلے زمانے میں مہمان کا آنا مبارک سمجھا جاتا تھا لیکن دعائیں دیجیے اس گرانی کو کہ اس نے اخلاقی قدریں تک بدل دیں اور اب مہمان مبارک نہیں موڈ کی خرابی کا باعث ہوتا ہے چنانچہ جب تک مہمان رہے میرا موڈ خراب رہا اور جب مہمان گئے تو گھر کا فلش خراب گیا اور آپ جانتے ہیں کہ موڈ کی خرابی سے تو صرف اپنے کو تکلیف ہوتی ہے لیکن فلش کے خراب ہو جانے سے گھر بھر کی جان عذاب میں پڑ جاتی ہے اور گھر میں گنجائش کے باوجود صبح ہی صبح محلے والوں کا گھر جھانکنا پڑتا ہے۔

چنانچہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد فلش کی صفائی کے لیے پلمبر کی تلاش میں نکلنا پڑا اتفاق سے راستے میں ایک دوست مل گئے ان سے جب اپنی بپتا سنائی تو انھوں نے کہا کہ میں یہ مصیبت بھگت چکا ہوں۔ آپ ادھر ادھر نہ جایئے فلش کی صفائی ہر پلمبر کا کام نہیں۔ میں پرچہ پر پتہ لکھے دیتا ہوں آپ اس پتہ پر

چلے جائیے۔ آدمی معقول ہیں کام ٹھیک کریں گے اور پیسے بھی مناسب لیں گے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم اندھے تو نہ تھے لیکن فلش کی خرابی سے چوندھیائے ہوئے ضرور تھے چناں چہ پتہ پوچھتے ہوئے ہم سیدھے پلمبر صاحب کی دوکان پہونچے اس وقت تقریباً دس بجے ہوں گے وہاں بہت سے لوگ بیٹھے تھے ہم نے اپنے دوست کے وسیلے سے اپنا تعارف کرادیا اور اپنی درد بھری کہانی کافی رقت آمیز لہجے میں سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ہمیں جتنی جلد ممکن ہو اس مصیبت سے نجات دلائیں جو اپنی لائی ہوئی نہیں ہے۔ انھوں نے ہماری عرضداشت بڑی ہمدردی سے سنی لیکن انھوں نے اس دن فلش کی صفائی سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ آج اتوار ہے اس لئے صفائی کرنے والے کا ملنا مشکل ہے۔ اور کل اتوار ہے کل کے لیے بھی وہ کوئی پکی بات نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمارے بہت گڑگڑانے کے بعد وہ اس پر تیار ہوئے کہ وہ شام کو آکر اس کا معائنہ کرلیں گے اور دوسرے دن کسی طرح اس کی صفائی کا انتظام کردیں گے ہم نے انھیں اپنا پورا پتہ اچھی طرح بتایا اور یہ دعا کرتے ہوئے واپس ہوئے کہ اللہ ان کے دل میں رحم ڈال دے اور وہ کل کے بجائے آج ہی کوئی انتظام کردیں۔

شاید اللہ میاں نے ہماری دعا قبول کرلی اور قبل اس کے کہ ہم گھر پہونچیں ایک صاحب ہمارے گھر پہونچ گئے اور انھوں نے ہمارا نام مع القاب و آداب کے لے کر پکارا اور کہا کہ آپ کے یہاں کا فلش خراب ہے ہم صفائی کے لئے آئے ہیں۔ صفائی کا نام سنتے ہی بیگم مارے خوشی کے اس طرح اچھل پڑیں جیسے فلش کی صفائی نہیں بلکہ ملک سے بدعنوانی کی صفائی کا مژدہ لے کر کوئی فرشتۂ رحمت آیا ہو لیکن انھوں نے احتیاطاً پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ اس مختصر سے سوال کے جواب میں اس مستعد صفائی کرنے والے نے پوری تفصیل

سے یہ بتایا کہ میں کس طرح اس کی دوکان پر اپنے ایک دوست کے وسیلے سے گیا اور میں نے اس سے اپنی — پریشانی کا اظہار اتنے دردبھرے لہجے میں کیا کہ وہ تہوار ہونے کے باوجود فلش کی صفائی کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ اس کی اس ہمدردی سے بیگم بھی بہت متاثر ہوئیں لیکن انھوں نے پوچھا کہ "وہ کہاں ہیں؟ اس پر اس نے نہایت سعادت مندی سے کہا کہ چچا (یعنی میں) تو ذرا دیر میں آئیں گے اپنے کسی دوست کے یہاں جانے کو کہہ رہے تھے۔ آپ کچھ فکر نہ کیجئے میں منٹوں میں فلش کی صفائی کر دوں گا یہ تو اپنے گھر کا کام ہے۔ چناں چہ وہ یہ کہتے کہتے پردہ کرنے سے پہلے ہی گھر والوں کی طرح گھر میں داخل ہو گئے اور نیچے سے پوچھ کر فلش کا معائنہ شروع کر دیا۔ اور وہاں سے یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے اس میں کام ہی کیا ہے مگر کوئی دوسرا ہوتا تو پندرہ روپئے سے کم کی بات نہ کی جاتی لیکن یہ تو اپنے گھر کا کام ہے جو چاہے ——

دیدیجئے گا۔ بس ایک سیڑھی کا انتظام کر دیجئے (فلش کوٹھے پر تھا اس لیے سیڑھی کی ضرورت تھی) نیچے میں دیکھ آیا ہوں، راڈ تھا کور خراب گیا ہے اس کے ٹھیک کرنے کے لیے بازار سے کچھ سامان لانا ہوگا۔ آپ جب تک سیڑھی منگوائیے میں ابھی بازار سے سامان لیے آتا ہوں کچھ زیادہ نہیں بس پانچ روپے کا سامان ہوگا میں پائی پائی کا حساب لکھ کر دے دوں گا۔ چچا نے کہا تھا کہ سامان وغیرہ کے لیے دام گھر میں لے لینا اور صفائی کا بل بعد کو مجھے دیدینا اس پر بیگم نے کچھ نہ بتایا اور کہا سنی بیگ لے کر خود چلے گئے اور کہہ دیا کہ سامان کے پیسے گھر میں لے لینا۔ اس پر نیک دل صفائی کرنے والے نے کہا کہ میری دکان دور نہ ہوتی تو میں وہیں سے روپئے لے آتا۔ اس کے بعد اس نے میرے لڑکے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ جاؤ! بھیا سامنے انسپکٹر صاحب کے گھر سے پانچ روپے تھوڑی دیر کے لئے مانگ لاؤ کہو امّی نے مانگے ہیں۔ اس پر بیگم نے بھی کہا ہاں! بیٹا جا مانگ لا تاکہ جلد صفائی

ہوجائے ناک بند کئے کئے دم گھٹا جا رہا ہے نوٹ لے کر بازار جاتے وقت اس نے پھر کہا دیکھئے سیڑھی ضرور سنگوار کھئے گا ورنہ خواہ مخواہ دیر ہوگئی اور چچا آگئے تو مجھ پر بلاوجہ ڈانٹ پڑے گی ۔

تھوڑی دیر بعد چچا تو آ گئے لیکن بھتیجے شاید چچا کی ڈانٹ کے ڈر سے بازار سے واپس نہ ہوئے اور جب بیگم نے چچا کو ان کے بھتیجے کا حلیہ بتایا تو وہ دنگ رہ گئے کیونکہ جن ہمبر صاحب سے ان کی بات چیت ہوئی تھی ان کا نہ تو سیاہ رنگ تھا اور نہ سیاہ قلب ۔ یہ قصہ سن کر مرزا صاحب کے چہرے پر تسکین کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور وہ بڑی طمانیت سے بولے کہا نہ تھا کہ مفلسی میں آٹا گیلا ہونے کے لئے آٹے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ پیسے کی کمی کافی ہے ۔

شیخ جی محفلِ رنداں میں

شب کی زلفیں بکھر چکی تھیں، ہولے ہولے ہوا چل رہی تھی، طبیعت موزوں تھی، سونے سے پہلے فکرِ سخن کی سوجھی آنکھ بند کر کے گنگنانے لگے خیالات کی یکسوئی بے نغمہ نیند بن کر دماغ پر چھا گئی اور اشعار کہنے کے بجائے ہم خواب دیکھنے لگے۔

اب جو محفل ہمارے سامنے جمی تھی اس میں صدرِ مشاعرہ تھے اور نہ شمعِ محفل۔ پرانے اور نئے بھی شاعر موجود تھے لیکن شمع خاموش تھی اور جام گردش میں تھا۔ اشعار کے بجائے جام و سبو کی کھنکار سنائی دے رہی تھی۔ صدر کی جگہ پیرِ مغاں جلوہ فرما تھے اور سامعین کے بجائے ساقی اور مغبچے دھوم مچائے ہوئے تھے۔

ابھی دو ہی دور چلے ہوں گے کہ در میخانہ پر دستک کی آواز سنائی دی۔ مغبچے نے لپک کر کنڈی کھولی اور ریاض خیرآبادی جو پینے کے بجائے رندوں کی پاسبانی کے لیے در ہی کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے شیخ جی کو خراماں خراماں میخانے میں داخل ہوتے دیکھ کر ساقی سے اشاروں میں کہا ؎

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ
ہمارے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ نہ ملے

دستار باندھے اور ہاتھ میں عصا لئے جب شیخ جی کو رندوں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو گھبرا کر ریاض صاحب سے پکار کر کہا ؎

اٹھوا دو میز سے مے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

ریاضؔ صاحب پیتے تو نہ تھے لیکن پینے والوں پر گہری نظر رکھتے تھے وہ شیخ جی کے لڑکھڑاتے قدم دیکھ کر فوراً تاڑ گئے اور شیخ جی کی اس لغزش پیرانہ پر جب ساقی کو بھی مسکراتے دیکھا تو شیخ جی کی صفائی میں کسی کا یہ شعر پڑھا ؎

جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہو

شیخ کا یہ حال دیکھ کر رندوں کی ہمت بندھی اور وہ سب داغؔ صاحب کی قیادت میں خیر مقدم کے لئے آگے بڑھے۔ داغؔ صاحب نے کورنش بجا لانے کے بعد شیخ کی خدمت میں جام پیش کیا اور جب انھیں پس و پیش کرتے دیکھا تو شوخی سے کہا ؎

مے سے پرہیز شیخ توبہ کرو
اک یہی چیز تو ہے پینے کی

شیخ کو پینے میں تو زیادہ پس و پیش نہ تھا لیکن اپنے کو اچانک رندوں کے نرغے میں دیکھ کر گھبرا سے گئے اکبرؔ نے قیافہ شناسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

شیخ جی پینا تو چاہتے تھے لیکن پی نہ سکتے تھے۔ رند پلانا چاہتے تھے لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ ذوقؔ نے ہمت بڑھاتے ہوئے بڑھ کر کہا ؎

محتسب گرچہ دل آزار ہے مے خواروں کا
دیکھئے اک جام تو ہے یار بھی یاروں کا

شیخ رندوں کے مسلسل وار سے جھنجھلا سے گئے اور گھبرا کر جام ہاتھ میں لے ہی لیا اس پر فیض نے نعرہ لگایا ؎

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

شیخ نے جام تو ہاتھ میں لے لیا لیکن منہ میں لگانے کے بجائے منہ بنانے لگے۔ ظاہر یہ کرنا چاہتے تھے کہ خوشی سے نہیں، رندوں کی خاطر سے پی رہے ہیں لیکن ریاض اداشناس کب دھوکا کھانے والے تھے وہ تاڑ گئے اور مسکرا کے کہا کہ ؎

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

شیخ کو منہ بنا کر پیتے دیکھا تو بنت عنب کی اس توہین پر شاد عظیم آبادی کو بڑا تاؤ آیا اور انھوں نے شیخ کو منہ چڑھا کر مے تلخ کا ایک پورا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا ؎

الٰہی شیخ کی دستار کو سلامت رکھ
عجیب چیز ہے رندوں کی دل لگی کے لئے

پھر دل لگی ہی دل لگی میں کسی نے شیخ کی پگڑی اچھال دی اور ان کا ننگا سر دیکھ کر ریاض صاحب کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا ؎

اتر گئی سر بازار شیخ کی پگڑی
گرہ میں دام نہ ہوں گے ادھار پی ہوگی

اس پر جام اٹھا کر جھومتے ہوئے مرزا غالب نے کہا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

شیخ جی کے دل میں فاقہ مستی کے رنگ لانے کا ڈر ایسا سمایا کہ وہ پاگلوں کی طرح جام و سبو پھینکنے لگے۔ مے و مینا کی شان میں یہ گستاخی جگر سے برداشت نہیں ہوئی اور انھوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا ؎

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

اس پھینک توڑ اور چیخ پکار پر میخانے میں اودھم مچ گیا اور شیخ جی نے اسی میں خیریت جانی کہ میخانے سے منہ پر چھپتے ہوئے چپکے سے کھسک جائیں لیکن داغ نے دیکھ لیا اور رندوں کو باخبر کرتے ہوئے کہا ؎

منھ چھپائے ہوئے میخانے سے جاتے ہیں وہ
مے کشو! ہیں یہ بڑے مرشد کامل لینا

یہ سنتے ہی رند چوکنا ہو گئے اور شیخ جی نے جب بھاگنے کی گنجائش نہ دیکھی تو جان بچانے کے لئے ایک خم کے پیچھے چھپ گئے۔ ابھی ساقی و مغبچے کرسیا اور میز کے نیچے شیخ کو تلاش ہی کر رہے تھے کہ میز پر کھڑے ہو کر داغ نے اپنی نظر دوڑائی تو شیخ کی پگڑی خم کے پیچھے سے نمودار ہو گئی اور داغ نے پیر مغاں سے پکار کر کہا ؎

دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو

یہ سننا تھا کہ سب دوڑ پڑے اور شیخ پر لعن طعن شروع کر دی اور پورا میخانہ سر پر اٹھا لیا۔ صلح جو اکبر کو بلا وجہ کا یہ ہنگامہ برا لگا اور انھوں نے

سمجھاتے ہوئے کہا ؎

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی ہے

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ اکبر کے بیچ بچاؤ سے شیخ کو بڑی ڈھارس بندھی اور وہ اپنی جھنیپ مٹانے کے لئے پگڑی سنبھال کر لگے نصیحت کرنے۔ توبہ شکن موسم میں توبہ کی تلقین پر صبیح مانکپوری نے مسکرا کر کہا ؎

سچ کہا تھا تو نے زاہد، زہر قاتل ہے شراب
ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

دوسری طرف انشا نے ساقی کے نازک ہاتھوں سے جام لیتے ہوئے کہا ؎

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

اس پر دل شاہ جہاں پوری کا بھی دل بے قابو ہو گیا اور اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ؎

اپنے ہاتھوں سے دیا یار نے مینا مجھ کو
رخصت اے توبہ کہ لازم ہوا پینا مجھ کو

لیکن شیخ اپنی خو سے مجبور تھے اس لئے انھوں نے اپنی بے وقت کی راگنی جاری رکھی اور مے خواروں کو مے خانے سے پرہیز اور مسجد جانے کی تلقین کرتے رہے۔

اس پر کسی رند باصفا نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے شیخ کی نادانی پر طنز کیا اور کہا ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو

ابّا سولہ آنے ٹھیک تھی شیخ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور ہر طرف سے ناؤ و نوش کی صدا سن کر ایسے حواس باختہ ہوئے کہ سر پر پیر رکھ کر بے تحاشا بھاگے لیکن راستے میں ایک منبھیچے سے ایسی مڈبھیڑ ہوئی کہ قلا بازی کھا کر مے سے بھرے مٹکے میں ڈبکیاں کھانے لگے پیرمغاں شیخ کی بے تکی باتوں پر اب تک صبر کئے بیٹھا تھا۔ لیکن مے سے بھرے ہوئے مٹکے کو اس طرح چوپٹ کرتے دیکھ کر اس کے صبر کا جام لبریز ہو گیا اور اس نے لپک کر شیخ کی ٹانگ لی اور منبھچوں کو للکارا پھر کیا تھا منبھچوں کو مانگی مراد ملی۔ وہ تالیاں بجاتے اور یہ گاتے ہوئے شیخ کو لاد کر باہر لے آئے کہ

شیخ جی محفلِ رنداں میں بہت آئے گئے
خود سے مجبور رہتے کچھ وعظ بھی فرمائے گئے
آخر اس طرح وہ محفل سے نکلوائے گئے
پا بدستے دگرے دست بدستے دگرے

عیادت

بیماری کی مصیبت تو خیر قدرت کی جانب سے آتی ہے وہ تو چار و ناچار جھیلنا ہی پڑتی ہے لیکن دوستوں، عزیزوں اور جان پہچان کے لوگوں کے ذریعہ عیادت کی شکل میں بے چارے بیمار کے سر پہ جو مصیبت بن بلائے نازل ہوتی ہے وہ مرے پہ سو دُرے کا کام کرتی ہے اور بیمار کا کچومر نکال دیتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس مصیبت کے نازل ہونے پر بچارہ بیمار نہ تو چیخ پکار کر سکتا ہے اور نہ شکوہ شکایت بلکہ ناتوانی کے باوجود اسے اس مصیبت کو خوشی خوشی مسکراتے ہوئے برداشت کرنا پڑتا ہے جس سے اخلاقاً اسکے لب تو مسکراتے ہیں لیکن دل اُٹھ اُٹھ آنسو روتا ہے اندرونی غم کو ظاہری مسرت سے چھپانے کی کوشش اسے اتنا نڈھال کر دیتی ہے کہ اس میں غالب صاحب کی طرح یہ کہنے کا بھی یارا نہیں رہتا کہ ؎

اُن کے آنے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض عیادت کرنے والے بیمار کا حال اچھا سمجھ کر ایسے جم جاتے ہیں کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے اور معلوم ہوتا ہے کہ عیادت کرنے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ بیمار کی روح قبض کرنے آئے ہیں اور ملک الموت کے ساتھ ہی یہاں سے اٹھ کر جائیں گے۔

ایک مرتبہ مجھے ٹائیفائڈ ہوا اور ایسا زبردست ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے گھر والے دوائیاں فراہم کرتے کرتے مالی لحاظ سے چوڑ چوڑ اور تیمار دار دوائیاں پلاتے پلاتے جسمانی لحاظ سے بالکل نڈھال ہو گئے اور نہ تھکنے والوں میں بس منت میں عیادت کے لئے آنے والے احباب اور فیس لے کر علاج کرنے والے ڈاکٹر رہ گئے تھے جن کے جوش عیادت میں نہ تو ذرہ برابر فرق آیا اور نہ ڈاکٹر کی مستعدی میں کوئی کمی۔ ڈاکٹر صاحب ہفتے میں ایک آدھ بار آتے لیکن عیادت کرنے والے دن میں کئی کئی بار۔ بقول شخصے ان نیک دل عیادت کرنے والوں نے انجانے سکوں سے مرنا بھی مشکل کر دیا تھا۔

مریض کے پاس عیادت کے لئے جو لوگ آتے ہیں وہ شاید اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ مرض، مریض، دوا اور پرہیز کے سوا اور کسی موضوع پر بات چیت نہ کریں۔ مثلاً ایک صاحب جو ہمارے بڑے خاص اور پابندی سے عیادت کے لیے آتے تھے وہ اس کا خیال کئے بغیر کہ اس کا اثر مریض پر کیا پڑے گا۔ یوں سلسلہ کلام شروع کرتے تھے بھئی! یہ ٹائیفائڈ بڑا ہی موذی مرض ہے اللہ اس سے بچائے بخار اترنے کے بعد بھی مہینوں بڑا احتیاط رکھنا پڑتا ہے اگر ذرا بھی بدپرہیزی ہو گئی تو مرض پلٹا کھا جاتا ہے اور پھر سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں میں تو بھائی اچھی طرح بھگت چکا ہوں نا اسی لئے ٹائیفائڈ کا نام سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جس طرح شادی کا بیچا کھلتا ہے اسی طرح اس مرض کی پچھاڑ بھی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اگر ذرا بھی بے احتیاطی ہوئی تو معاملہ بالکل چوپٹ ہو جاتا ہے۔ آخر میں بڑی چوکسی کی ضرورت ہوتی ہے اگر ڈاکٹر بتا بھی دے تب بھی جہاں تک ہو سکے غذا نہ کھائی جائے بعض ڈاکٹر کمزوری جلد دور کرنے کی فکر میں بخار اترنے کے دو ہی چار دن بعد مریض کو شوربہ روٹی پر لگا دیتے

ہیں اور یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ مہینوں کی سوکھی کمزور آنتیں شوربہ روٹی کا بار اٹھا بھی پائیں گی۔؟

مجھے دیکھو! میں اسی شوربہ روٹی ہی کا مارا ہوا ہوں۔ ہاں! تو ہوا یہ کہ ایک مہینے مسلسل بخار رہنے کے بعد اللہ اللہ کرکے جب بخار اترا! تو بھوک بھی کھلی سنترے اور موسم بی کا رس پیتے پیتے طبیعت ایسی گھبرا گئی تھی کہ موسم بی اور سنترے کی صورت دیکھتے ہی ابکائیاں آنے لگیں تھیں شامت اعمال ڈاکٹر صاحب آئے تو میرے منہ سے نکل گیا کہ ڈاکٹر صاحب بخار سے نہیں مرا تو کیا اب بھوکوں مار ڈالنے کا ارادہ ہے تین دن ہوئے بخار نام کو بھی نہیں ہے۔ لیکن غذا منہ تک اڑ کر بھی نہیں گئی ہے۔ آنتیں بھوک سے کلا رہی ہیں خدا کے لئے اب تو کچھ کھانے کو بتایئے دوا، عرق اور رس پیتے پیتے جی اکتا گیا ہے وہ یہ سنتے ہی بڑی للک سے بولے ارے آپ کو کس نے کھانے سے منع کیا تیل کھٹائی، مرچ کے علاوہ جو جی میں آئے کھایئے۔

میں نے کہا ارے ڈاکٹر صاحب یہ ظالم تیماردار تو کھانے دیں بہت خوشامد درآمد کے بعد تولہ بھر صابو دانہ کھانے کو دیا اس پہ ہزاروں دھونس کہ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے موج میں آکر بڑی فراخ دلی سے کہا کچھ نہیں آپ مزے میں شوربہ روٹی کھایئے۔ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں اب تو نئے ڈاکٹر ۱۰۴ ڈگری بخار میں بھی غذا بند نہیں کرتے۔ یہ مژدۂ جاں فزا سنتے ہی میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اور مجھے جتنی دعائیں یاد تھیں میں نے اس فراخ دل ڈاکٹر کو دل ہی دل میں دے ڈالیں۔ اور شوربہ روٹی کی خوشبو میرے دماغ کو معطر کرنے لگی۔

ڈاکٹر صاحب کے جاتے ہی میں نے شوربہ روٹی جلد لانے کے لیے گھر

سر پہ اٹھا لیا اور جب تک کھانے کی کشتی سامنے نہ آگئی میں نے لوگوں کا بیٹھنا دوبھر کر دیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور بھوکا کیا چاہے دو روٹی۔ چنانچہ پہلے ہی حملے میں دو چپاتیاں اور پیالہ بھر شوربہ ہڑپ کر گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا مجھے تو ہوش نہیں لوگ کہتے ہیں کہ شوربہ روٹی کھا کر اس زور شور کا بخار چڑھا کہ چنا ڈالدو تو بھن جائے سارا بنڈا آگ کی طرح دہکنے لگا۔

میں تو بے ہوش تھا ہی میرا یہ حال دیکھ کر گھر والے بھی ہوش کھو بیٹھے اور جہاں ابھی چند گھنٹے پہلے غسل صحت کی تیاریاں کی جا رہی تھیں وہاں حشر برپا ہو گیا۔ سر پر برف کی تھیلی رکھی گئی، ڈاکٹر کو فوراً بلایا گیا وہ بیچارے حواس باختہ بھاگے ہوئے آئے تھرما میٹر لگایا تو ان کے ہاتھ کے بھی طوطے اڑ گئے پیروں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی تھرما میٹر کے نمبر دھندلے ہو گئے تھے گھبراہٹ میں ۱۰۵ ڈگری بخار کو ۱۰۰ سمجھ بیٹھے ہاتھ سے تھرما میٹر گر کر چکنا چور ہو گیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ریلیپس یعنی بخار پلٹا کھا گیا۔

ابھی عیادت کرنے والے صاحب یہیں تک کہہ پائے تھے کہ میرا دل الٹنے پلٹنے لگا اور ان کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتے کرتے میری آنکھیں چڑھنے لگیں اور طبیعت بے طرح گھبرانے لگی۔ میں نے اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے آنکھیں بند کر لیں تب جا کے انھوں نے اپنی بیماری کی داستان بند کی اور میرے پاس سے ہٹے۔

ایک محترمہ بیچاری مجھ سے بڑی محبت کرتی تھیں اور جب تک میں بیمار رہا اپنی گھریلو مصروفیتوں کے باوجود ہر دوسرے تیسرے دن ضرور دیکھنے آتیں اور آتے ہی جانے کا ارادہ ظاہر کرتیں اور کہتیں کیا کہوں گھر گرہستی کے جنجال دمار نکلنے کی فرصت نہیں ملتی برسوں کہیں جانا نہیں ہوتا بھائی برادری کے لوگ معلوم نہیں کیا خیال کرتے ہوں گے۔ تم تو خیر اپنا خون ہو تمہیں کیسے

دیکھنے نہ آؤں تمہیں دیکھے بغیر تو چین ہی نہیں پڑتا اللہ گواہ ہے سچ کہتی ہوں اگر بال بچوں کا جھمیلا نہ ہوتا تو بھلا میں بیماری کی حالت میں تم سے الگ رہ سکتی مگر کوئی اور مدد نہیں کر سکتی تھی تو تمہاری دیکھ بھال تو کر ہی سکتی تھی ۔

مگر اللہ جیتا رکھے منو اور شنو کو کہ وہ میرے بغیر ایک منٹ بھی گھر میں ٹک ہی نہیں سکتے آج ہی جیسے میں تمہارے یہاں آنے کو تیار ہوئی کہ شنو پاس کھڑی ہو کر ٹھونکنے لگی لاکھ سمجھایا کہ اری اللہ کی بندی! میں کہیں شادی بیاہ میں تو جا نہیں رہی ہوں اپنے بیمار بھائی کو دیکھنے جا رہی ہوں وہاں تمہارا کیا کام مگر اللہ بچائے بچہ رکھے اس بالک ہٹ سے مرنے کی ایک ہی ٹانگ نہ ماننا تھا کسی طرح نہ مانی میں نے سوچا ان سے کہوں گی تو وہ خواہ مخواہ ڈانٹ پھٹکار شروع کر دیں گے تم تو اپنے دولھا بھائی کو جانتے ہی ہو کہ پیار کریں گے تو ایسا کہ بچوں کو سر پر چڑھا لیں گے اور تاؤ آ جائے گا تو وہ لوبدی مار دیں گے کہ توبہ بھلی ۔ اس لئے میں نے شنو سے کہا چپکے سے کپڑے پہن اور چل ورنہ تیرا لقیا اسکول سے آگیا تو غضب ہی ہو جائے گا ۔

اس نے جب سے تمہاری بیماری کا حال سنا ہے دن رات اچھے ماموں کی رٹ لگائے رہتا وہ بھلا مجھے اکیلا کیسے آنے دے گا وہ تو میری جان کو ہو جائے گا ابھی میں شنو کو یہ سمجھا ہی رہی تھی کہ دیکھا میاں منو بغل میں بستہ دبائے پھدکتے چلے آ رہے ہیں اللہ نظر بد سے بچائے بڑا ذہین ہے مجھے جیسے ہی تیاری کرتے دیکھا فوراً تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو میں تمہیں دیکھنے جا رہی ہوں ۔ اور ہم بھی جائیں گے ، ہم بھی جائیں گے کی رٹ لگا دی ۔ میں نے کہا ارے بابا جب تو ہو میں اچھے ماموں کے یہاں نہیں جا رہی ہوں وہ چڑھ کر بولا تو پھر کپڑے بدل کر کہاں جا رہی ہیں ؟ جھنجھلاہٹ میں میرے منہ سے نکل گیا کہ جھک مارنے جا رہی ہوں ، اب کیا تھا اس نے رٹ لگا دی ہم بھی جھک مارنے جائیں گے ۔

اس کے بعد میں بھی میاں منو کی نہ صرف ذہانت کا بلکہ صاف گوئی کا بھی قائل ہو گیا کہ انھوں نے صاف صاف وہ مقصد ظاہر کر دیا جس مقصد سے ان کی امی اچھے ماموں کے یہاں جا رہی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جھک جاری رکھی اور ہم صبر کے ساتھ میاں منو کا انتظار کرتے رہے کہ وہ آکر اپنی امی سے کہیں "آیئے امی! اب گھر چل کر جھک ماریں۔"

ایک دوسرے بزرگ عیادت کے لئے آتے تو ہفتے میں ایک ہی بار تھے لیکن ڈاکٹری علاج اور اس کی دوائیوں کے خراب اثرات کا وہ بھیانک منظر کھینچتے تھے کہ کلیجہ تھرتھرانے لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب ڈاکٹر نہیں بلکہ ملک الموت ہیں جنھیں روح قبض کرنے کا کام سپرد کرنے سے پہلے اللہ میاں نے ٹریننگ کے لئے دنیا میں بھیجا ہے اور جب تک ان بزرگ کی تقریر جاری رہتی ہمارے سامنے ڈاکٹر کی شکل میں موت ناچتی رہتی۔

ان کا خیال تھا کہ ہر ڈاکٹری دوا انتہائی گرم ہوتی ہے اسی لئے ڈاکٹر لوگ اس کی دف مارنے کے لئے ہر مریض کو دودھ دیئے جانے کی ہدایت ضرور کرتے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ بخار میں اور پھر گرمی کے موسم میں ڈاکٹری علاج کس طرح خطرے سے خالی نہیں اور میں جس قدر جلد ممکن ہو اس خطرے سے نکلنے کی کوشش کروں یوں تو اللہ نظر بد سے بچائے وہ خود حکیم نہیں تو نیم حکیم ضرور تھے۔ اسی لئے شاید ان کا خیال تھا کہ اگر مرنا ہی ہے تو ڈاکٹر کی گرم دوائیں پی کر مرنے سے تو بدرجہا بہتر ہے کہ نیم حکیم کی ٹھنڈی دوائیں استعمال کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے مرا جائے لیکن ان کا پیچھا ہے غلط بات نہ کہوں گا بچارے نے کبھی اپنا علاج کرانے کو نہیں کہا لیکن اپنے محلے کے ایک حکیم صاحب کی اتنی تعریفیں کرتے کہ اگر میں ان کی نیک نیتی سے واقف نہ ہوتا تو مجھے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ بزرگ یا تو ان حکیم صاحب کے ایجنٹ ہیں یا

ان کے نسخے ان کے یہاں بند ھے آتے ہیں۔

ایک دن ایک عزیزہ عیادت کے لیے اس ساز و سامان سے آئیں کہ مجھے ایسا لگا کہ وہ میری عیادت کے لئے نہیں بلکہ میری شگنی کے لئے آئی ہیں۔ ریشمی تہذیب کا امام ضامن ہاتھ میں لئے ٹوکری میں پھل اور تولیے میں گلوکوز اور مکھن کے ڈبے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ جبتیا رکھے آدھا درجن چھوٹے بڑے ہر سائز کے بچے لئے ہوئے آئیں۔ بیچاری نے بڑے خلوص سے بازو پر امام ضامن باندھا اور بڑے آداب سے بیٹھ گئیں۔ دوا، علاج کے متعلق ضروری باتیں پوچھیں اور خاموش ہو گئیں لیکن میں حیرت میں تھا کہ یہ کیسی عیادت کہ جس میں مریض کو ہکان کئے بغیر خاموشی سے بیٹھ جایا جائے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آ گیا کہ اگر یہ نہ تو اند پسر تمام کند، والا مضمون ہے ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ان کی ایک بچی بے تحاشا بھاگتی ہوئی ان پر دھڑام سے آ کر گر پڑی اور اس کے بعد یکے با دیگرے اس کے دو عدد بھائی ان پر اس طرح گرے جس طرح کمزور مریض پر زور دار عیادت کرنے والے گرتے ہیں۔ اُن بیچاری نے جلد ہی بہن بھائیوں کا جھگڑا کسی طرح رفع دفع کرایا تو دونوں بھائی پھل والی ٹوکری پر جھپٹے انھوں نے ٹوکری اٹھا کر اپنی حفاظت میں لے لی اور انھیں گھور کر دیکھا اتنے میں بچّوں کی نظر ٹوکری کی طرف سے ہٹ کر ان سنتروں پر پڑی جو میرے سرہانے میز پر رکھے تھے وہ سنتروں پر جھپٹے نہیں لیکن ان کی معصوم للچائی نظریں کبھی سنتروں پر پڑتیں اور کبھی مجھ سے التجا کرتیں مجھ میں نہ اٹھنے کی سکت تھی اور نہ زور سے بولنے کی اس لئے میں نے نظروں کا جواب نظروں ہی میں دیا اور آپ جانتے ہیں کہ بچّے نظر خوب پہچانتے ہیں چنانچہ وہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہی ایک ساتھ دونوں سنتروں پر لپکے اور ساتھ ہی وہ گلاس بھی لیتے گئے جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ سنترے اُن کے ہاتھوں میں تھے اور

گلاس ان کے پیروں کے پاس ان کی امی کے دل کی طرح چکنا چور پڑا تھا لڈکے سنترے کھارہے تھے اور وہ خون کے گھونٹ پی رہی تھیں، ان کا چہرہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا تھا۔ میرا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں بچوں کی پٹائی نہ شروع ہو جائے کہ ان کی چیخ پکار سے میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔ لیکن ان سمجھ دار بی بی نے نہ تو بچوں کو مارا اور نہ لڑکا را بلکہ جنگ جو بچوں کے ساتھ عیادت کے لئے آنے پر شرمندگی ظاہر کی اور جلدی واپس چلی گئیں۔

عیادت نہ تو کوئی بری عادت ہے اور نہ مریض کے لئے مصیبت بشرطیکہ عیادت، عیادت کی طرح کی جائے اور اسے طول دے کر قیامت نہ بنا دیا جائے جس سے نہ صرف مریض بلکہ مریض کے گھر والے بھی عاجز آکر موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔

خدا نہ کرے آپ کو عیادت کا وہ بھیانک منظر دیکھنے کو ملا ہو جسے بدقسمتی سے مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

بہت دن ہوئے میرے ایک عزیز بیمار پڑے وہ دیہات میں رہتے تھے اور کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اتفاق سے ان کا گاؤں بھی بالکل سڑک کے قریب ہی تھا۔ آنے جانے کی کوئی دشواری نہ تھی۔ اس لئے میں نے بھی عیادت کا ارادہ کیا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عیادت سے بیمار کو چاہے کچھ زحمت ہو لیکن اس سے اسے ایک نامعلوم مسرت بھی ضرور ہوتی ہے شاید اس طرح اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے ——

—— کہ وہ ان بے بس بیماروں میں نہیں ہے جن بیچاروں کی بیماری کی اطلاع دوسروں کو اسی وقت ہوتی ہے جب گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

میں نے اس خیال سے کہ تیمارداروں کو بیمار کی دیکھ بھال کے علاوہ میری

خاطر عبارات کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے گی جانے اور شام تک واپس آنے کا پروگرام بنایا۔ لیکن جب میں وہاں پہونچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی بیمار کے گھر نہیں آیا ہوں بلکہ ایسے گھر آیا ہوں جہاں برات ٹکی ہے۔

باہر برآمدے میں کچھ بوڑھے باتیں کر رہے تھے اور حقہ پی رہے تھے اور کمرے میں نوجوانوں کی ایک ٹولی تاش کھیل رہی تھی اور سگرٹ پی رہی تھی میرے پہونچتے ہی یہ دونوں ضروری کام تھوڑی دیر کے لئے رک گئے۔ صاحب سلامت اور خیریت خیر سلاّ کے بعد میں بیمار کی عیادت کو اندر جانے کے لئے اٹھا۔ قریبی عزیز تھے پردے دردے کا تو کوئی سوال نہ تھا لیکن جیسے ہی میں ڈیوڑھی کے پاس پہونچا ویسے ہی میرے بھتیجے صاحب نے کہا چچا جان یہیں تشریف رکھیے باہر ہی چائے آرہی ہے اندر کچھ پردے دار مہمان ہیں۔ دل تو یہی چاہا کہ کہہ دوں کہ میں چائے پینے نہیں اپنے بھائی کو دیکھنے آیا ہوں۔ لیکن باہر جتنے لوگ بیٹھے تھے ان کے مطمئن چہرے مسکرا کر یہ کہتے ہوئے معلوم ہوئے کہ بھائی صاحب! اتنی بھی کیا جلدی آخر ہم لوگ بھی تو عیادت ہی کی غرض سے دور دور سے مقیم ہیں۔

مجھے برا تو لگا لیکن میں نے چار و ناچار باہر بیٹھ کر چائے پینا شروع کر دیا۔ اتنے میں اندر سے نوکرانی آئی اور کہا چلیئے بھیا! پردہ ہو گیا۔ میں نے چپکے سے پوچھا یہ پردہ دار کون آ گیا؟ وہ بولی بڑے بھیا کی اچھے گاؤں والی سرہج ہوئیں۔

میں نے کہا کب آئیں؟

اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ دئی تو بیماری کی کھبر سنتے ہی آئے گئی رہیں! میں نے کہا اور کون ہے؟

اس نے ذرا گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا سیئے کھاندان والی ہیں گر سب آپ سے پردہ کرنے والی اور کوئی بی بی نہیں ہیں۔

میں اندر پہونچا تو مجھے وہاں بھی وہ چہل پہل نظر آئی جو عام طور پر شادی کے موقعہ پر ہوتی ہے۔ بس بچاری بھابھی۔ بھائی صاحب کے پاس تخت پر اداس بیٹھی نظر آئیں اور باقی لڑکے لڑکیاں نوکر اور نوکرانیاں بیمار کی تیمار داری نہیں عیادت کے لئے آنے والی بیویوں کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھیں

بھابھی بچاری اس بار سے بالکل نڈھال نظر آرہی تھیں جو بیمار کی تیمار داری کے علاوہ عیادت کے لئے آنے والوں کی میزبانی کی بنا پر ان کے سر پر لدا ہوا تھا۔ جتنی دیر وہاں رہا مجھے یہ دیکھ دیکھ کر کوفت ہوتی رہی کہ گھر والوں کی جتنی توجہ بیمار کو وقت سے دوا پلانے بخار دیکھنے، آرام پہونچانے اور دیکھ بھال میں صرف ہونی چاہیے تھی اس کا اکثر حصہ عیادت کرنے والوں اور والیوں نے اپنی خاطر مدارات کے لئے انجانے ہڑپ کر لیا تھا اور بعض بعض بڑی محبت سے یہ کہتی سنائی دیتی تھیں۔

بہن! میں نے تو جیسے ہی بڑے بھیا کی بیماری کا حال سنا سن سی رہ گئی، انھوں نے لاکھ کہا کہ میں جا کر دیکھ آؤں تم پھر چلی جانا میں نے ان کی بات ایک نہ مانی بھلا مانتی بھی تو کیسے کوئی ناتے رشتے کے تو ہیں نہیں اپنا خون ہیں کہیں دور رہنے سے ہاتھ کی لکیریں مٹ جاتی ہیں مجھے تو اس وقت تک چین نہ پڑا جب تک میں نے اپنے بھیا کو اپنی نظروں سے دیکھ نہ لیا۔ انھوں نے دوسرے ہی دن سے چلو چلو کی رٹ لگا دی۔ میں نے کہا ہٹو! تمہیں اپنا گھر عزیز ہے مجھے اپنا بھائی۔ تم جاؤ میں تو اس وقت تک جانے کی نہیں جب تک میرا بیرن بھیا اٹھ کر کھڑا نہ ہو جائے گا۔

مگر مجھے عیادت کرنے والوں کی اس بھیڑ بھاڑ میں بڑے بھیا کے جلد اٹھ کھڑے ہونے کی معصوم تمنا سسکیاں لیتی نظر آئی کیوں کہ بیچارے

گھر والوں کو مہمانوں کی خاطرداری ہی سے دم مارنے کی مہلت نہ ملتی تھی وہ بیمار کی ٹھیک سے تیمارداری کیا کرتے ۔

پیرو کار اور منشی

بھائی صاحب آداب عرض !

میں نے کہا جیتے رہو سب خیریت ہے۔

پیرو کار :- جی ہاں ! زندہ ہوں۔

میں :- میرا مطلب کچھ کام دام کر رہے ہو۔

پیرو کار :- جی ! آپ جانتے ہیں زمینداری عرصہ ہوا ختم ہوگئی سیر رہ گئی تھی وہ آدھی سے زائد ادھو اسیوں کی نذر ہوگئی باقی کا مقدمہ چل رہا ہے نام میرے ضرور ہے قبضہ کاشتکاروں کا ہے۔

میں نے کہا لکھنؤ کیسے آنا ہوا ؟

کہنے لگے سوچا کہ جب کچہری کی خاک چھاننی ہی ہے تو بیٹھے سے بیگار بھلی کے مصداق اگر دوسروں کا کام بنا کر کچھ اپنا بھی بھلا کیا جائے تو کیا حرج ہے۔ کچھ نہیں سفر خرچ تو نکل ہی آئے گا اور احسان گھاتے میں ہوگا۔

میں :- تو یہ کہو کہ مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں آئے ہو۔

پیرو کار :- صرف پیروی نہیں کچھ اور بھی کام تھا پھر عرصہ ہوا آپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اماں نے کہا تھا کہ لکھنؤ جانا تو بھیا سے ضرور ملنا۔ میں آپ ہی کے یہاں جا رہا تھا اچھا ہوا کہ آپ یہیں مل گئے ورنہ پہونچنے میں

شاید دقت ہوتی۔

میں :- مگر یہ تو تبادُ پیروی کے لئے تمہیں بارہ بنکی کے بجائے لکھنؤ آنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔؟

بات یہ ہے بھائی صاحب! کہ میں جس مقدمہ کی پیروی کر رہا ہوں اسے قتل کے الزام میں سات سال کی سزا سشن سے ہوگئی ہے اب ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں اپیل دائر کرنی ہے۔

اب باتیں کرتے کرتے ہم دونوں مکان پہونچ گئے وہ جھولا میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور میں کپڑے اتارنے کے لئے اندر چلا گیا۔ انھوں نے بڑی محبت سے میرے چھوٹے لڑکے مجو کو پکڑ کر گود میں بٹھا لیا اور نوکرانی سے کہا جاؤ بھاوج سے میرا سلام کہہ دو اور کہو کہ اماں نے کہا ہے کہ کیا اب زندگی میں دلہن کو پھر نہ دیکھ سکوں گی۔ پہلے گرمیوں میں آم کھانے سب بال بچے آجاتے تھے اسی بہانے ہم لوگ بھی دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے تھے جب سے بھیّا نے باغ بیچ ڈالا سال بچھلے بچوں کا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔ بھاوج سے کہنا اماں نے بہت بہت پوچھا ہے اور یہ لو ایک درجن انڈے بھیجے ہیں۔

نوکرانی انڈے لے کر اندر گئی اور انھوں نے جھولے سے آدھا درجن کیلے نکال کر لڑکے کو پکڑا دیئے۔ وہ کیلا چھیلتا ہوا خوشی خوشی اندر پہونچا اور میری واپسی تک انھوں نے اندر سے باہر تک اچھا خاصہ رسوخ پیدا کر لیا اور تھوڑی ہی دیر میں اندر سے چائے کی کشتی اُن کے سامنے آگئی۔

چائے سے فراغت کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے آپ کے جاننے والوں میں کوئی معقول وکیل تو نہیں ہوں گے۔

میں نے کہا کہ کچہری کی کچ کچ اور وکیلوں کی بک بک سے گھبرا کر وکالت

چھوڑ چھاڑ اخبار کے دفتر میں پناہ لی جب سے وکیلوں کو دیکھ کر ڈر اور کچہری کا نام سن کر بخار چڑھ آتا ہے یوں تو میرے ایک ساتھی اپنی محنت جانی کی وجہ سے ابھی تک وکالت کر رہے ہیں مگر چلتے پرزے کم ہیں اور پڑھنے لکھنے زیادہ ہیں اس لئے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی کیونکہ موکل پڑھنے لکھنے والے وکیل کے مقابلہ میں چلتے پرزے وکیل کو زیادہ پسند کرتا ہے۔

وہ بولے مگر ہمارے موکل کا مقدمہ کچھ پیچیدہ تو ہے نہیں چاہے مسل پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجئے۔ شناخت کے تینوں گواہ جرح میں قریب قریب ٹوٹ گئے ہیں ایک کانسٹبل نے جرح میں یہاں تک کہہ دیا کہ عدالت میں حاضر کرنے سے پہلے ملزم کو تھانے میں سب کے سامنے بٹھایا گیا۔ اب آپ جانتے ہیں کہ قتل کے مقدمہ میں اس شناخت کی کیا وقعت رہ گئی۔

میں نے اپنی جان چھڑانے کے لئے کہا کہ تمہارا کام ان سے چل جائے تو ایک چٹھی ان کو لکھ دوں۔ ان کے منشی بھی ہمارے یہاں کبھی کبھار آجاتے ہیں ان سے بھی میرا نام لے لینا آسانی ہوگی۔

اس کے بعد وہ گدی کھجلاتے ہوئے دھیرے سے بولے مگر وہ پیروکار کو کتنے فی صدی دیتے ہیں۔ آپ کے ملنے سے پہلے ایک وکیل صاحب سے بات چیت ہوئی تھی وہ پندرہ فیصدی کمیشن دینے کو تیار ہیں۔ مگر میں نے ۲۵ فیصدی سے کم آج تک کسی وکیل سے نہیں لیا۔ ساری محنت ہماری ہی ہوتی ہے۔ وکیل تو دروازے پر کھڑی گائے کا دودھ دودھ لیتے ہیں۔ پیروکار موکل کو چیتے یار بنا کر اور وکیل صاحب کی تعریف میں قصیدے سنا کر ان کے دروازے لا کھڑا کرتا ہے ورنہ آپ جانتے ہیں آج کل وکیلوں کی کیا کمی کچہریوں میں موکل کم وکیل زیادہ دکھائی دیتے ہیں بقول شخصے۔

ایک ڈھونڈھو ہزار ملتے ہیں

میں نے کہا بھئی! میری معلومات اس معاملہ میں بہت ناقص ہیں میں تو آج تک یہی سمجھتا تھا کہ وکیل صرف لیتا ہے مگر اب معلوم ہوا کہ وہ دیتا بھی ہے۔

اس کے جواب میں انھوں نے فلسفیانہ انداز میں کہا کہ دنیا میں لین دین کے بغیر کام نہیں چلتا اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے کا مقولہ سولہ آنے صحیح ہے۔ وہ وکیل جو صرف لیتے ہیں اور دیتے نہیں ان کے دروازے پر موکلوں کے بجائے گدھے لوٹتے ہیں اور مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔

میں نے تفریحاً کہا اور دلالوں کے ساتھ آنے والے موکل کیا گدھوں سے کم ہوتے ہیں جو وکیل اور منشی کے ہاتھوں مونڈے جانے کے ساتھ ساتھ دلال صاحب کے تیز استرے کے چرکے بھی کھاتے ہیں جس سے ان کی ایسی حجامت بن جاتی ہے کہ زندگی بھر چندیا پر بال نہیں جم پاتے۔

دلال کا لفظ بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا تھا جس سے میں کچھ شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ بہرحال تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کی واپسی کا تو کوئی سوال نہ تھا۔ مگر میں بطور مرہم پٹی کے لیپ پوت کی کوشش کرنے لگا اور میں نے کہا بھئی واقعہ یہ ہے کہ مقدمہ کی پیروی وکالت سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے وکیل کا کام تو کچہری میں ختم ہو جاتا ہے مگر پیروکار کو کچہری اور کچہری کے باہر دونوں جگہ نپٹنا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کچہری کے کام کے مقابلہ میں کچہری کے باہر کا کام مشکل بھی ہوتا ہے اور چونکہ بھئی یہ سنتے ہی ان کے چہرے کی بدمزگی اس طرح دور ہو گئی جیسے رشوت ملنے کے بعد کچہری کے اہلکاروں کی بے رخی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ذرا جوش کے ساتھ بولے۔ ارے صاحب! یہ نہ پوچھئے! کہ پیروی میں ہمیں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ثبوت کے گواہوں کے توڑنے میں دانتوں

پسینہ آجاتا ہے کبھی کبھی تو فوجداری تک نوبت آجاتی اور جان جوکھم میں پڑ جاتی ہے اور جب وہاں پر کھیل کر اور خدا خدا کرکے یہ مہم سر ہوتی ہے تو پھر صفائی کے گواہوں کی تلاش میں در در کی خاک چھاننی پڑتی ہے اور جس سے بات کرنی بھی کبھی پسند نہ کی تھی اسے بھیا منوا کر کے منانا پڑتا ہے اور جب تک اس کی گواہی نہیں گزر جاتی اس کی ایسی تلو چپڑ اور خاطر مدارات کرنی ہوتی ہے جیسے ووٹنگ سے پہلے ووٹر کی کرنی پڑتی ہے۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بول اٹھا اور گواہی گزرنے کے بعد غالباً اس کا بھی وہی حشر ہوتا ہوگا جو ووٹنگ کے بعد ووٹر کا ہوتا ہے یعنی موٹر پر آتا ہے اور پیدل رگڑتا جاتا ہے۔

نہ بھئی نہیں بھائی صاحب گواہ کو تو گواہی کے بعد بھی سنبھالے رکھنا پڑتا ہے کیونکہ گواہی کے بعد اس کے جرح میں ٹوٹ جانے کا خطرہ باقی رہ جاتا ہے۔

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ میرے وکیل دوست کے منشی جی بالکل اسی طرح کمرے میں آپہنچے جیسے سونگھتا چیونٹی شکر کی خوشبو پاکر بند ڈبے میں پہونچ جاتی ہے۔

میں نے کہا بڑی عمر ہے منشی جی آپ کی۔ ابھی آپ کا خیال ہی ذہن میں آیا تھا کہ آپ آگئے (اور زبان پر انگریزی کی وہ مثل آتے آتے رہ گئی جو آپ سب کو معلوم ہے) منشی جی ہمارے یہاں مہینے دو مہینے کے بعد بن بلائے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوجایا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچہری سے آتے وقت ان کی ملاقات وکیل صاحب سے نہیں ہوتی اور موکل چرکہ دے کر ان کا حق دیئے بغیر کچہری سے چلتا بنا اب بیچارے دیہات میں اپنے گھر جائیں تو کیسے۔ لڑکا بیمار ہے دوا ابھی لے جانی ہے اس لئے وکیل صاحب کے دوست

ہونے کے ناتے ہمارا فرض ہے کہ ان کے کرایہ کا انتظام کریں اور نیکی کر کنویں میں ڈال کے مصداق ہم وکیل صاحب سے اس کا ذکر کر نہیں پاتے اور منشی جی کو کیا پڑی ہے جو خواہ مخواہ ایسی غیر ضروری باتیں کہہ کر اپنا اور وکیل صاحب کا قیمتی وقت ضائع کریں اور قرض کی ادائگی سے اپنے کو یا اپنے وکیل صاحب کو زیر بار کریں۔

آج قبل اس کے کہ وہ اظہار مدعا کریں ہم نے ان کا تعارف ان پیروکار صاحب سے کرانا شروع کر دیا ہے جو ہمارے پاس مناسب وکیل کی تلاش میں مدد حاصل کرتے آئے تھے۔

دیکھو بھائی یہ ہیں وکیل صاحب کے منشی ہیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا تھا بڑے کام کے آدمی ہیں۔ یہ جس وکیل کے تخت پر بیٹھ جائیں اس پر موکل اس طرح گرتے ہیں جس طرح مٹھائی پر مکھیاں۔ ہمارے منشی جی ان ٹٹ پنجیے منشیوں میں نہیں ہیں جو وکیلوں کے گھروں کا چکر لگایا کرتے ہیں یہ خود گھر کے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ جوار میں اچھا خاصا اثر ہے ہر ہفتے جب گھر جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی نیا موکل ساتھ لاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈگن لگا کر کچہری چلے آتے ہیں اور جب واپس جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی مچھلی کٹیا میں پھنسی ملتی ہے بات یہ ہے کہ منشی جی کی صحبت میں رہ کر ان کے بھائی بھتیجے بھی مقدمہ بازی اور مقدمہ سازی کے تمام گُر جان گئے ہیں اس لئے ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اور یہ ہوں یا نہ ہوں ذرا سی تو تو میں میں اور گالی گلوچ پر خود رپٹ لکھوا کر مقدمہ کھڑا کرا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

منشی جی کو گھر جانے کی دیر ہو رہی تھی اس لئے وہ اپنی تعریف سے خوش تو ہو رہے تھے لیکن اس کی طوالت سے کچھ بے چینی سی محسوس کر رہے تھے اس کے بعد میں نے کہا کہ بھئی اب تم خود ان سے ہائی کورٹ میں اپیل کے سلسلے میں بات چیت کر لو یہ یہ کسی نہ کسی وکیل کا انتظام تمہارے حسب منشا کرا دیں گے۔ یہ ہیں تو ہمارے دوست

کے منشی لیکن پاس پڑوس کے وکیلوں پر رحم کھا کر ایک آدھ موکل اچھے داموں پر ادھر ادھر بھی کھسکا دیتے ہیں۔ اس لئے سبھی وکیلوں سے ان کی یاد اللہ ہے۔

منشی جی بولے لیکن آپ نے ان کی تعریف تو کچھ کی ہی نہیں۔ میں نے کہا یہ اپنا تعارف مجھ سے اچھی طرح آپ سے کرا دیں گے۔ اس لیے خواہ مخواہ میں کیوں وقت ضائع کروں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ بھی اگر آپ کے ہم پیشہ نہیں تو ہم پلہ ضرور ہیں یعنی منشی نہیں پیروکار ہیں۔ یہ کہہ کر میں اس لئے اندر چلا گیا کہ حق، حقوق کے معاملات تنہائی میں زیادہ اچھی طرح طے ہو سکیں گے۔ اب منشی جی میں اور پیروکار صاحب میں جو باتیں ہو رہی ہیں وہ ذرا کان لگا کر سنیئے کیوں کہ یہ راز کی باتیں ہیں اس لئے چپکے چپکے ہو رہی ہیں۔

پیروکار صاحب بولے ـــــ منشی جی کیا کہوں زمینداری تو ختم ہو گئی لیکن مقدمہ بازی سے چھٹکارا نہ ملا کوئی نہ کوئی جھگڑا ٹنٹا ہوتا ہی رہتا ہے سوچا تھا خاتمہ زمینداری کے بعد خاموشی سے گھر پر بیٹھ کر کھیتی باڑی کروں گا اور کچہری کے پاس نہ پھٹکوں گا لیکن صاحب بالا دستوں کی زیادتی دیکھی نہیں جاتی گاؤں کے پردھان اور پٹواری نے اپنی پرانی دشمنی میں ہمارے پرانے آسامیوں کو ناحق قتل میں در دفعہ کو سے ملا کر پھنسا دیا۔ بیچاروں کے گھر والے تین دن تک میرا گھر گھیرے رہے اب آپ ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں کان دبائے گھر میں کیسے بیٹھا رہ سکتا تھا بادل ناخواستہ کمر کسنی پڑی اور کچہری کا رخ کرنا پڑا۔

آپ جانتے ہیں کہ آج کل سفید پوشی برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ بقول شخصے باہر اتنے تنے گھر میں چوہے پکتے۔ رکھ رکھاؤ وہی رکھنا پڑتا ہے لیکن جیب کا حال ظاہر ہے اس لئے سوچا سیشن سے بیگار ٹالی سیشن تک جیسے تیسے پیروی کی۔ جرح میں سب گواہوں کو توڑ دیا مقدمہ میں کوئی جان نہیں رہ گئی لیکن ان بیچاروں کی بدنصیبی کہ

ان کا مقدمہ جس عدالت میں تھا وہ جج مقدمہ کو چھوڑنا تو جانتا ہی نہیں۔ کہتا ہے کہ پکڑ کر چھوڑنا چڑدیمار کا کام ہے اس لئے سشن میں مقدمہ سزا یاب ہو گیا

اب ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنی ہے بھائی صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے آپ کے وکیل صاحب کا نام لیا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے وکیل صاحب سے کام نہ بن پائے گا کیوں کہ شاید آپ نے انھیں صرف فیس لینا سکھایا ہے لیکن کمیشن دینا نہیں سکھایا اور اپنا یہ حال ہے کہ جیڑ تنا تیئے پیروکاروں کی طرح ہم اپنا ریٹ کبھی نہیں گراتے اور ۵ ۲ فیصدی سے ایک پیسہ کم نہیں لیتے منشی جی اگر آپ کی نظر میں ایسا کوئی معقول وکیل ہو کہ اپنا بھی بھلا کرتے اور ہمارا بھی تو معاملہ طے کرا دیجئے۔

منشی جی نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا کہ ارے بھئی اپنے یہاں وکیلوں کی کیا کمی ٹکے سیر سے لے کر سونا مول جس بھاؤ کا وکیل چاہیئے مل جائے گا۔ مگر یہ کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اپنے وکیل کے تخت سے دوسرے وکیل کے تخت تک مفت نہیں پہونچا دوں گا۔ آپ کو اس کا معقول کرایہ ادا کرنا ہوگا۔

پیروکار صاحب منشی جی کے اس اشارے کو شاید سمجھے نہیں کیونکہ انھیں اپنے مطلب کی بات کے علاوہ دوسری بات سمجھنے میں ذرا دیر لگتی ہے اس لیے جواب دینے میں وہ ہچکچانے لگے۔ اس پر منشی جی نے بات صاف کرتے ہوئے کہا کہ بھئی جیسے تم پیروکاری کے فی صدی ۵ ۲ لیتے ہو اسی طرح میں بار برداری کے پانچ فیصدی لیتا ہوں

اب پیروکار صاحب بات سمجھ گئے تھے اس لئے فوراً بولے بھائی ہمارے یہاں دیہات میں رسم ہے کہ کرایہ تو وہ دیتا ہے جس کے گھر جایا جاتا ہے اس لئے پچیس پیروکاری کے اور پانچ بار برداری کے ملا کر تیس فیصدی کمیشن پر کوئی وکیل طے کرو۔

منشی جی مسکراتے ہوئے بولے وکیل تو طے ہو جائے گا لیکن جیسے سستا سودا خریدار کو بار بار رلاتا ہے اسی طرح سستا وکیل موکل کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔

اس پر پیروکار صاحب بولے اس کی فکر نہ کیجئے مقدمہ میں بالکل جان نہیں رہ گئی ہے۔ میں نے سارا کس بل سیشن ہی میں نکال دیا ہے بس وکالت نامہ لگا کر عدالت کے سامنے کھڑے ہو جانا ہے۔ مقدمہ کا فیصلہ تو اپنے حق میں ہونا ہی ہے۔

اس کے بعد منشی جی نے منہ بنا کر کہا بھائی میں تیرہ ادھار کے مقابلہ میں نو نقد غنیمت سمجھتا ہوں اور تم جانتے ہو آج کل سڑیل سے سڑیل وکیل بھی ڈیڑھ سو سے کم پر کیا طے ہوگا۔ اس لئے چاہتا ہوں میرے حق کے ساڑھے سات ادھار کے بجائے پانچ نقد اسی وقت دیدو۔ آپ ایڈیٹر صاحب کے جاننے والوں میں ہیں آپ سے پہلے نہ مانگتا جب چاہتے دیدیتے لیکن بات یہ ہے کہ مجھے گھر جانا ہے اور موزی موکل میرا حق دیئے بغیر کھسک گیا۔ وکیل صاحب کو کچہری میں اور گھر میں سب جگہ ڈھونڈھ مارا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ وکیل صاحب کی بیگم صاحبہ میکے گئی ہیں ورنہ انہیں سے مانگ لیتا۔ مجھے آج گھر جانا ضروری ہے۔ وہ اپنی ہے۔ وکیل صاحب ایڈیٹر [illegible] آپ تو بڑے نیک آدمی ہیں جب بھی ایسا موقع ہوتا ہے انہی کے پاس چلا آتا ہوں کبھی انکار نہ کیا لیکن جب اپنی محنت کے مل رہے ہیں تو مانگنے میں کیا حرج ورنہ روز روز مانگتے اچھا بھی نہیں لگتا۔

اب میری عجیب حالت تھی میں پیروکار صاحب کے جواب کا منشی جی سے زیادہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کیونکہ اگر انھوں نے باربرداری کے نقد دام نہ دیئے ـــــ تو منشی جی کو گھر تک جانے کا کرایہ مجھی کو ادا کرنا ہوگا اس لیے پیروکار صاحب کو حیلہ حجت کا موقع دیئے بغیر میں فوراً کمرہ میں پہونچ گیا تاکہ وہ سنیما کر منشی جی کی فرمائش فوراً پوری کر دیں اور منشی جی کی نظرِ عنایت میری طرف نہ ہونے پائے لیکن ستارے بگڑے ہوئے تھے روزے گلے پڑے۔ منشی جی کی نظرِ عنایت سے

سے بچنے کی کوشش میں پیروکار صاحب کے جنگل میں پھنس گئے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی بولے بھائی صاحب! جیب میں بڑا نوٹ ہے آپ منشی جی کو پانچ روپے دے دیجیے۔ نوٹ بھنا کر میں آپ کو واپس کر دوں گا اب میری حالت قابل رحم تھی نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن اگر پیروکار صاحب کو نہیں دیتا ہوں تو منشی جی کے چکر میں آتا ہوں اس لئے میں نے آزمائے کو آزمانے کے بجائے نیا تجربہ کرنا مناسب خیال کیا اور منشی جی کے بجائے پیروکار صاحب کو قرض دینے کا فیصلہ کیا چنانچہ نوٹ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن یقین کیجئے کہ ہاتھ جیب میں جانے کے بعد کسی طرح باہر نکلنے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا وہ جیب میں منہ چھپا کر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح قرضدار قرض لینے کے بعد گھر میں بیٹھ رہتا ہے۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں یہ پانچ روپے کا تنہا نوٹ اکلوتے بیٹے سے زیادہ عزیز تھا بھلا اسے وعدوں کی تاریک وادی میں کیسے دھکیلا جا سکتا تھا۔

لیکن وقت کم تھا اور کام زیادہ منشی جی کو گھر بھی جانا تھا اور پیروکار صاحب کے لیے ان کے حسب منشا وکیل بھی طے کرنا تھا۔ پیروکار صاحب اور منشی جی دونوں کی نظریں ہاتھ کو جیب سے باہر نکالنے پر مجبور کر رہی تھیں اس لیے چار و ناچار اسے نکالنا ہی پڑا لیکن بالکل اس طرح جیسے جنازہ گھر سے باہر نکالا جاتا ہے میں نے نوٹ پیروکار صاحب کی طرف بڑھا دیا ان کا ہاتھ اس کے خیر مقدم کے لیے پہلے ہی سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد پیروکار صاحب اور منشی جی کمرے سے باہر اس تیزی سے نکل گئے ہیں جس تیزی سے ملک الموت روح قبض کر کے آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے۔

اس حادثہ سے نڈھال ہو کر میں مسہری پر مردے کی طرح بے حس و حرکت بڑی دیر تک پڑا رہا بیگم سمجھیں آرام کر رہا ہوں اس لیے انھوں نے اٹھانا مناسب نہ خیال

کیا پڑے پڑے میری آنکھ لگ گئی میں نے خواب میں دیکھا کہ موکل کے بال بچے بلک بلک کر رو رہے ہیں اور پیروکار، منشی جی، وکیل اور اہلکار مستعدی سے موکل کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں انصاف کی دیوی بال جھٹکائے، آنکھوں میں آنسو لیے سوگوار کھڑی ہے اور عدالت سے آواز آرہی ہے کہ کوئی حاضر ہے.

میں چونک کر اٹھ بیٹھا، بیگم نے کہا کہ پیروکار صاحب آئے تھے اپنا جھولا لے گئے اور کہہ گئے ہیں کہ وکیل صاحب کی فیس مہنگی دینی پڑی ہے پیسے کم پڑ گئے ہیں لینے جا رہا ہوں اس کے بعد کچھ رک رک کر ہکلاتے ہوئے بولیں مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ اس کے لیے واپسی میں دو درجن انڈے لائیں گے. بیگم جب سے انڈوں کی آمد کا اور میں نوٹ کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں یوں تو بیگم "دیر آید درست آید" کی قائل ضرور ہیں لیکن ڈر رہی ہیں کہ کہیں انڈے گندے نہ ہو جائیں۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بارہؔ بج چکے تھے لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گرمی کے ڈر سے آنے کی ہمت نہیں کر رہی ہے۔ ہم کروٹیں بدل رہے تھے اور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے ؎

جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

نیند کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سولی کے تختے پر بھی آجاتی ہے ہم سولی کے تختے پر نہیں آگ کے بستر پر لیٹے ہوئے نیند کا انتظار کر رہے تھے۔ شاعروں نے آگ سے لطف لیا ہے لیکن اس وقت جب ؎

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

دونوں طرف لگی ہوئی آگ میں آگ کی سوزش نہیں الفت کا مزہ آتا ہے لیکن یہاں یک طرفہ آگ لگی تھی اور لطف یہ کہ نہ تو آگ لگانے والے کا پتہ چل رہا تھا اور نہ کہیں دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ آگ لگانے اور بجھانے دونوں فن کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ؎

لگے آگ اور دھواں نہ ہو
کہیں آج تک تو ہوا نہیں

آتشِ عشق سے لے کر ایٹم بم کی آگ کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں دھواں ضرور چلے

کی طرح پیچھے لگا ہوا ہے۔ بس ایک بھوک کی وہ روحانی آگ ہے جو دھوئیں سے پاک و صاف ہے اسی لئے سنا ہے کہ دنیا میں بھوکے رہنے والوں پر دوزخ کی آنچ حرام ہو جاتی ہے کیونکہ بھوک کی آگ انھیں زندگی ہی میں جلا کر گناہوں سے پاک کر دیتی ہے یا یوں سمجھئے کہ وہ دنیا ہی میں دوزخ کا اتنا مزہ چکھ لیتے ہیں کہ ان کے لئے دوزخ کی آنچ بے ضرر ہو جاتی ہے اور ان کا دوزخ میں ڈالنا بے فائدہ۔

جہاں تک ایٹم بم کی آگ کا تعلق ہے، اس کا دھواں دیکھنے کی نہ تو تاب ہے اور نہ تمنا۔ ہیروشیما میں اس کے دھوئیں کے نتائج کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد اس کے دوبارہ دیکھنے کی خواہش صرف اسی دل میں پیدا ہو سکتی ہے جو بوم صفت ہو اور اسے بربادی اور ویرانی بھاتی ہے لیکن حاصل ہوتی ہو رہی آتش عشق الفت کا دھواں دیکھنے کا اسے موقعہ حاصل نہ ہوا کہ بھوک کی آگ بجھنے سے فرصت ہی نہ ملی کہ محبت کی آگ بھڑکاتے اور دھواں دیکھتے۔

آپ کو شاید یہ نہ معلوم ہو کہ عشق کی آگ وہ آگ ہے جس کو بجھانے کے لئے لوگ فائر بریگیڈ کے بجائے اپنے دوستوں کو پریشان کرتے ہیں اور ان سے پانی چھڑکنے کی فرمائش کرنے کے بجائے، اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ان کی دماغ خراشی کرتے ہیں۔ چنانچہ آج رات کے گیارہ بجے بڑی مشکل سے اپنے آتش زدہ نہیں عشق زدہ دوست کو ان کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں مرغ بسمل کی طرح تڑپتا چھوڑ کر اپنے تپتے ہوئے فلیٹ میں آکر سونے کے لئے نہیں سینکنے کے لئے چارپائی پر لیٹ گیا اور ابھی میں نیند آتی ہے یا نہیں آتی کی منزل ہی میں تھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ عشق کی آگ پورے بدن میں پھیلی جا رہی ہے۔

میں ڈرا کہ مرض عشق متعدی ہوتا ہے کہیں لگ تو نہیں گیا میرے دوست کی

دوسری بات ہے ان کے باپ بڑے نیتا اور ان کے بھائی بڑے ٹھیکے دار ہیں۔ باپ دل میں قوم کا درد لئے دن بھر جلسوں اور کانفرنسوں میں دھواں دھار تقریریں کرکے اپنے ووٹ پکے کیا کرتے ہیں اور بھائی موٹر لئے دفتروں سے پرمٹ حاصل کیا کرتے ہیں۔ ذرائع وسیع ہیں روپے کی بہتات ہے۔ میرے دوست کو روزگار کی تلاش نہیں بلکہ روزگار خود ان کی تلاش میں ہے اسی لئے انھوں نے عشق کی گود میں پناہ لے رکھی ہے اور میری طرح غم روزگار میں گھلنے کے بجائے غم عشق میں گھلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھ سے جو کہتے ہیں اس لیے ان کے واسطے عشق موٹاپے کا علاج ہے خطرے کا باعث نہیں لیکن میں سہما جا رہا تھا کہ اگر یہ مرض مجھے لگ گیا تو میں بے موت مرجاؤں گا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بوڑھے باپ اور بیمار ماں کو زندہ درگور کرکے نصف درجن بھائی بہنوں کو بے بسی اور غریبی کا مزہ چکھنے کے لیے ایک ایسے سماج میں بے سہارا چھوڑ جاؤں گا جہاں آزاد مقابلہ کے مہذب نام سے خونخوار بھیڑیے اور بے بس بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پینے کے لئے صرف اس لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ بکری پیاسی رہنے کے باوجود شکایت نہ کرسکے۔

جس طرح خانہ خالی میں دیو کے داخلہ کا اندیشہ رہتا ہے اسی طرح تنہائی میں عشق کے حملے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے تنہائی دور کرنے کے لیے شلف سے غالب صاحب کو اٹھا کر پوچھا کہ ؎

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

اس پر غالب صاحب نے خلاف توقع بہت رنجیدہ اور سنجیدہ ہوکر کہا کہ بھائی ریمپی دھاکوں اور نئے زمانہ کی ہولناک جنگوں سے ایک طرف موت بے وقت آنے لگی ہے دوسری طرف نیند نے وقت پر بھی آنا چھوڑ دیا ہے اس

اس لیے اب مانگنے سے : موت وقت پر آسکتی ہے نہ نیند۔ اس کے بعد میں چارپائی
پر لیٹ کر نیند بلانے کے بجائے جلدی کی پر قبلہ رخ بیٹھ کر دنیا کو جنگ سے نجات ملنے
کی دعا مانگنے لگا کیونکہ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی اور سوئی ہوئی
گلی انگڑائی لے رہی تھی۔

ہمسائی کا حلوا

شب برات کا نام آتے ہی منہ میں حلوا سا گھلنے لگتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خیال آجاتا ہے کہ کہیں بیگم یہ نہ کہہ دیں کہ یہ منہ اور مسور کی دال بات یہ ہے کہ بیگم ہم سے اور ہم سے کیا ہمارے وزیر غذا سے بھی زیادہ آٹے دال کے بھاؤ سے واقف ہیں اور اخبار اور ریڈیو سے اگر انھیں کوئی دلچسپی ہے تو وہ صرف اس لئے ہے کہ انھیں بازار بھاؤ بڑی پابندی سے دیا جاتا ہے۔ ہندوستان تو ہندوستان انھیں پاکستان کے آٹے دال کا بھاؤ بھی زبانی یاد ہے اس لئے شب برات کا نام آتے ہی ہماری طرح ان کے منہ میں پانی آنے کے بجائے ان کا ذہن میدہ، روا، گھی اور شکر کے داموں کو پہاڑے پڑھنے لگتا ہے۔ اور ہمارے حلوے کے شیریں خواب کی تعبیر الٹی نظر آنے لگتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ آج کل میدے روے اور بناسپتی کے دام آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور شکر تو اس طرح غائب ہو گئی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ماہرین علم جانوران کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں گدھے کے سر پر کالی لمبے اور نوکیلے سینگ تھے۔ اور وہ دولتی چلانا نہیں جانتا تھا لیکن پاسبان عقل کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس کی نوکیلی سینگیں لوگوں کا ناک میں دم کئے ہوئے تھیں۔ اس کے سامنے سے نکلنا مشکل تھا۔ لوگ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اس کے آگے آگے چلنے کے بجائے پیچھے چلنا ہی مناسب خیال کرتے تھے اور اسی کا اثر ہے کہ آپ آج کل بھی دیکھیں

گے کہ بعض زمانہ شناس لوگ خشکا کھانے والے گدھے کے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے چلتے ہیں۔

ہمیں حلوا کھانے کا تو بڑا شوق ہے لیکن ہم میں گدھوں کے پیچھے ادب کے ساتھ چلنے کا سلیقہ بالکل نہیں ہے اسی لیے ہماری قسمت میں حلوا کھانے کے بجائے حلوے کے شیریں خواب کی تلخ تعبیر دیکھنا لکھا ہے۔

ابھی ہم اچھی طرح حلوے کا خواب بھی نہ دیکھنے پائے تھے کہ دروازے پر ہمارے ایک بے تکلف دوست نے صدا دی اور ہم چونک کر دروازے کی طرف دوڑے کہ شاید وہ خواب کی میٹھی تعبیر لے کر آئے ہوں لیکن انھوں نے ہماری طرف حلوے سے بھری ہوئی تشتری بڑھانے کے بجائے اپنا خالی ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا اور ساتھ ہی ساتھ فرمانے لگے ابا یار کچھ حلوا وغیرہ کھلواؤ ؟

اس کے جواب میں میں نے جل کر کہا کہ کیا تمہاری بیگم صاحبہ نے تمہیں شب برات کے دن کان پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا ہے کہ جاؤ مانگو کھاؤ !

اس پر انھوں نے روتی آواز میں کہا کہ مجھے نہیں نکالا بلکہ حلوے کا حسب منشا انتظام نہ ہونے کی بنا پر خفا ہو کر خود میکے چلی گئیں۔

میں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو اور اچھا ہے اب تم یہ کرو کہ ایک تیز رکشے پر سوار ہو کر ان سے پہلے ہی سسرال پہنچ جاؤ اور خوش دامن کو ادب سے سلام کر کے کہو کیا وہ ابھی نہیں آئیں ؟ میں ذرا ایک ضروری کام سے باہر چلا گیا تھا واپس آیا تو گھر میں تالا دیکھ کر یہ سمجھا کہ تیوہار کا دن ہے، شاید گھر چلی گئی ہوں معلوم ہوتا ہے کہیں راستے میں رک گئیں۔ خیر جب آئیں تو کہہ دیجیے گا کہ میرے لیے اب ناشتہ وغیرہ کی ضرورت نہیں میں جہاں جا رہا ہوں وہیں ناشتہ کروں گا۔

ظاہر ہے کہ اس پر خوش دامن یہی کہیں گی۔ تو بیچ ایسا کون سا کام ہے کہ

بھوکے پیاسے نہار منہ گھر سے چل دو گے۔ صاحبزادے اگر وہاں تالا پڑا ہے تو کیا یہاں بھی تالا پڑ گیا ہے کہ تیوہار کے دن منہ میٹھا کیے بغیر چلے جاؤ گے۔ حلوا پوری تیار ہے کھاتے جاؤ۔

انھوں نے کہا کہ اگر ایسے میں کوئی مجرم سے جو آجائے تو کیا ہو؟ یعنی اگر اسی بیچ میں وہ آدھمکیں تو پھر تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

میں نے کہا کہ حلوا کھانے والے ان سب تو ہمات میں نہیں پڑتے۔ انھیں تو اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم شیخ کی طرح حرم میں رہ کر نامحرم ہی رہے اور کچہری میں کام کرنے کے باوجود تمھیں رشوت کھانے کا سلیقہ نہیں آیا۔ ارے بھائی رشوت اور حلوا بے دھڑک کھایا جاتا ہے کسی نے کہا نہیں ہے کہ ؎

نوٹ ہاتھوں میں وہ رشوت کے لیے پھرتے ہیں
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس لیے اگر چاہتے ہو کہ حلوا کھانے کے لیے ہم لوگوں کی طرح شبرات کے انتظار میں دن نہ گننا پڑیں۔ اور ہر روز عید اور ہر روز شب برات ہو تو رشوت کھانے کا سلیقہ سیکھو ورنہ خالی کچہری کے چکر لگانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ فائلیں اٹھاتے دھرتے زندگی بیت جائے گی۔ اور حلوا کھانے کی توفیق نہ ہوگی کسی بھولے بھٹے بھوے! پونے بڑے تیے کی بات کہی ہے کہ ؎

تنخواہ تو بے کار ہے رشوت ہے بڑی چیز

اور یہ بڑی چیز چھوٹے بڑے سبھی حسب مراتب کھاتے ہیں بس کھانے کے ڈھنگ الگ ہیں۔ بڑے افسر ڈالی کے نام سے بڑے لیڈر پارٹی فنڈ کے نام سے اور چھوٹے نیتا چندے کے نام سے کھاتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ خیر آپ اس وقت رشوت کھانے کا ڈھنگ بتانے کے بجائے حلوا کھلا دیجئے۔

میں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ مثل نہیں سنی کہ حقہ ملے حکمت سے اور حلوا ملے قسمت سے اور تم جانتے ہو کہ جب روز ازل قسمت بٹ رہی تھی تو ہم لوگ " پہلے آپ " کے تکلف میں پڑ کر پیچھے کھڑے رہے اور یاران تیز گام ہمارا حصہ بھی لے کر چلتے بنے۔ اس لیے حلوے کا ہمارے لئے کوئی سوال ہی نہیں اب رہا حقہ تو اس کے لئے حکمت کی ضرورت ہے اور حکیموں اور ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ حقے سے حلق خراب ہو کر کینسر ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جو ہماری آپ کی غریبی کی طرح لاعلاج ہے اس لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ حقہ پی کر ایک ساتھ دو لاعلاج مرض اپنے تن لاغر پر لاد لئے جائیں۔

انھوں نے کہا لیکن ہم نے سنا ہے کہ شب برات کے دن مردوں کی بھی قسمت جاگ اٹھتی ہے اور " پہ مزارے ما غریباں نے چراغے نے گلے " کے بجائے قبرستان میں بھی چراغاں ہوتا ہے۔

میں نے کہا :- میں کب کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد ہماری قبر سونی رہے گی بیسیوں ایسے میں لگے کہ زندگی میں جن کے گھر چراغ نہیں جلا لیکن مرنے کے بعد لوگ ان کی قبر پر ہر جمعرات کو پھول چڑھا کر اور چراغاں کر کے اپنے حلوے مانڈے کا انتظام کرتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ گر یار سے

نہیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے
نہ ہو قبر ہم تو اکیلے رہیں گے

میں نے کہا بھائی صاحب اس کا کیا کیا جائے زندگی میں تو اپنے حقے

بھی حور نہیں صرف وعدہ حور ہے اسی سے لو لگائے زندگی کے تلخ گھونٹ شراب طہور سمجھ کر پی رہے ہیں اور جی رہے ہیں۔

انھوں نے بگڑ کے کہا دیکھیے صاحب! آپ حور اور وعدہ حور کا قصہ چھیڑ کر حلوا گول نہیں کر سکتے میں نے بڑے معتبر نائی سے سنا ہے کہ اس مرتبہ گھر سے بہت زوردار حلوا آیا ہے۔

میں نے کہا جہاں آپ نے سنا ہے وہاں یہ بھی سن لیجیے کہ ؎

بھائی صاحب نے جو بھیجا ہمیں تھوڑا حلوا
نائی صاحب نے کیا تھوڑے کا تھوڑا حلوا

اب آپ ذرا ان معتبر نائی صاحب کا پتہ چلایئے تاکہ میں ان کے خلاف رپورٹ لکھوا کر آپ کے حصّے کا حلوا برآمد کرا سکوں۔

انھوں نے کہا حضور! ہم اس حلوے سے باز آیا جس میں تھانہ کوتوالی جانا پڑے جہاں کا نام سن کر حلوا بھی حلق سے اترنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا اچھا خفا نہ ہو حلوہ! بھائی نے جو حلوا بھیجا ہے اس سے تمھاری خاطر کریں لیکن یہ بتاؤ تمھاری بتیسی مضبوط ہے کہ میری طرح پائریا کی نذر ہو کر شترات کا حلوا کھانے کے لائق نہیں رہی۔ وجہ یہ ہے کہ بھائی اچھی طرح دیکھ لو کیونکہ حلوے کی نسل ہمارے طبقہ کی اقتصادی بدحالی کی ایسی ٹھوس نشانی ہے کہ اگر ذرا بھی دانت کمزور ہوئے تو سمجھ لو کہ دانت بھی حلوے کے ساتھ حلق کے نیچے اتر جائیں گے۔

انھوں نے فریاد کی اور کہا بخشیے! یہ دندان شکن حلوا آپ کو اور آپ کے بھائی کو مبارک!

بندہ تو مرغن حلوے کی تلاش میں کسی بڑے در پر دستک دینے کی سوچ رہا ہے۔

میں نے خوشی سے کہا خدا حافظ! نیک کام میں دیر نہ کیجیے۔

امتحان کا نتیجہ

انتظار چاہے جس چیز کا ہو تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن شاعروں کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ انتظار یار میں تکلیف کے ساتھ لذت بھی ہوتی ہے آپ کہیں گے کیا آپ کو خود انتظار یار کی لذت آمیز تکلیف کا کبھی تجربہ نہیں ہوا کہ آپ شاعروں کے توسط سے انتظار یار کا ذکر بالکل انجان بن کر فرما رہے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں جیسے ہی لوگ ہوش سنبھالتے تھے حسینوں پر مرنے لگتے تھے اور انھیں اتنی فراغت اور فرصت بھی حاصل تھی کہ تلاش روزگار میں دفتروں کے چکر لگانے کے بجائے کوچۂ یار میں یہ گاتے پھرتے کہ

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی حسینوں پر مرنے کے بجائے ہزاروں فکروں میں گھلنے لگتے ہیں اور انتظار یار کے بجائے ایسے غیر شاعرانہ انتظار کرنے پڑتے ہیں ——— کہ انتظار یار کا خیال سر پہ پیر رکھ کر رفوچکر ہو جاتا ہے۔

مثلاً چلچلاتی دھوپ میں کنٹرول کی دکان پر راشن کا انتظار۔ اسکول جانے کے لیے بس کا انتظار اور پھر امتحان دینے کے بعد نتیجہ کا انتظار۔

یہ آخری انتظار بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے کیونکہ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہفتوں نتیجے کے انتظار میں دن کا کھانا اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور بعض وقت نتیجہ نکلنے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوتا اور اب نتیجے کے انتظار میں پریس کے چکر لگانے کے بجائے صاحبزادے چاہے بھر پانی میں نہیں دریا میں ڈوب کر مرنے کے لیے پر تولنے لگتے ہیں اور بعد میں ماں باپ اور احباب کے غم کے خیال سے خودکشی کا ارادہ ترک کر کے محض سینما وغیرہ دیکھ کر دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نتیجے کے انتظار اور انتظار یار میں کچھ باتیں مشترک ہیں جس طرح ہر عاشق ناامیدیوں اور ناکامیوں کے باوجود بڑی مستعدی سے انتظار یار کرتا ہے اسی طرح دیکھا یہ گیا ہے کہ پھسڈی سے پھسڈی لڑکا سال بھر نہ پڑھنے اور سرگشتی کرتے رہنے کے باوجود امتحان کے نتیجہ کا انتظار اسی شدت سے کرتا ہے جس شوق سے پڑھنے والے محنتی اور تیز لڑکے کرتے ہیں۔

ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ امتحان میں وہی لڑکے فیل ہوتے ہیں جو پڑھتے لکھتے نہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ذہین اور پڑھنے والے لڑکے فیل اور رٹنے اور نقل کرنے والے لڑکے پاس ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ سال بھر کی پڑھائی اور لڑکے کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ امتحان ہال میں صرف تین گھنٹے کے پرچے کے ذریعہ کرنا آج نہیں تو بیس سال بعد معجزہ ہی خیال کیا جائے گا لیکن مجبوری کا نام صبر ہوتا ہے اس لئے جب تک صلاحیت کا صحیح اندازہ کرنے کا کوئی دوسرا بہتر طریقہ نہ معلوم ہو جائے پرانے ڈھرے پر چلنا ہی پڑے گا۔

یہ جملے جب میں لکھ رہا تھا تو ایک صاحب جو میرے پیچھے کھڑے تھے انھوں نے چپکے سے کہا گستاخی معاف! کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ محنت اور صلاحیت

کے باوجود جناب کو کتنی مرتبہ فیل ہونے کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ مجھے ان کی یہ مداخلت بری لگی، خاص طور پر اس لیے کہ خاکسار کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ اس غلط طریقہ امتحان کی بنا پر فیل ہونے کی زحمت گوارا کرنی پڑی تھی۔

فیل ہونے کے سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ فیل ہونے کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح منٹوں میں تمام عزیزوں اور دوستوں تک پہونچ جاتی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ عزیز اور دوست چاہے پاس ہونے پر مبارکباد دینے بھی نہ آئیں لیکن فیل ہونے پر اظہار ہمدردی کے لیے نہیں جلے پر نمک مرچ چھڑکنے فوراً پہونچ جاتے ہیں۔

جب کبھی ہم فیل ہوئے اور ہم نے چاہا کہ دو چار دن کسی عزیز یا دوست کا سامنا نہ ہو تو ادھر ان گلیوں میں بھی انکا سامنا ہو گیا جہاں ان کے ملنے کا سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور انھوں نے اپنا فرض خیال کیا کہ دور ہی سے پکار کر پوچھیں کہ کہو بھائی کس ڈویژن سے پاس ہوئے؟ ان کا یہ اظہار خلوص ایسا لگتا کہ جیسے وہ محض چڑھانے کے لئے ہم سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں اور دل چاہتا کہ کہہ دیں کہ آپ کی بلا سے ہم فیل ہوں یا پاس آپ کو کیا پڑی ہے کہ آپ گلیوں کے کونوں کھدروں میں ہمیں ڈھونڈھ کر ہمارا نتیجہ معلوم کر رہے ہیں حالانکہ جس سال ہم پاس ہوئے تو ہمارے سلام کرنے پر بھی آپ کو توفیق نہ ہوئی کہ آپ ہم سے پوچھ لیتے کہ کہو بھائی پاس ہو گئے؟ اور اب جبکہ ہم فیل ہو گئے تو آپ گلیوں میں منہ چھپا نکلنا بھی دشوار کئے ہوئے ہیں۔

پاس ہونے کی شکل میں ہم منتظر رہتے کہ محلے میں کوئی تقریب ہو یا خاندان میں کوئی بیاہ شادی ہو اور لوگ ہم سے نتیجہ پوچھیں اور ہم سر بلند کر کے جواب دے سکیں لیکن ہماری یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی بلکہ ایسا ہوا کہ اس ہفتے آنے والے مہمان بھی جیسے ہمارے گھر کا راستہ بھول گئے۔

بدقسمتی دیکھئے کہ جب کبھی فیل ہوئے تو اکثر ایسا ہوا کہ محلے اور خاندان میں کہیں نہ کہیں ضرور کوئی تقریب ہوئی تاکہ ہمارے فیل ہونے کا ڈھنڈھورا دور اور نزدیک کے تمام رشتہ داروں اور عزیزوں میں پیٹ دیا جائے اور ہماری رسوائی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

جس سال ہم پاس ہو جاتے تو ہم کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر اپنے ان عزیزوں کے یہاں بھی جاتے جن سے عام حالات میں ہمیں ملنے کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا لیکن بدقسمتی وہاں بھی ہم سے پہلے پہونچ جاتی اور دروازے پر کنڈی چڑھی ہوئی ملتی اور ہم اپنے پاس ہونے کی خوشخبری پہونچانے کی تمنا لئے ناکام گھر واپس آتے۔

سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ امتحان کے نتیجے کی اشاعت اور شادی بیاہ کا زور ایک ہی زمانہ میں ہوتا ہے۔ اور جس طرح مصیبت تنہا نہیں آتی اسی طرح شادیانہ دوسرے بھی ساتھ نہیں آتیں یعنی شادی اور امتحان میں کامیابی۔

ہوا یہ کہ عین اس وقت جب ہماری برات دروازے پر پہونچی اسی وقت شامت کے مارے ہمارے ایک مشترکہ عزیز شہر سے امتحان کا نتیجہ لے کر پہونچ گئے اور ہمارے نسبتی بھائی ہمارے لئے شربت کا انتظام کرنے کے بجائے ہماری شرمندگی کا سامان مہیا کرنے کے لئے ہمارا رول نمبر تلاش کرنے لگے جو ہمارے ہوش و حواس کی طرح بالکل غائب تھا۔

وہ تو کہئے خیریت یہ ہوئی کہ زمینداری ختم نہیں ہوئی تھی اور لڑکی والے ڈگری دیکھنے کے بجائے جائداد پر نظر رکھتے تھے۔ ورنہ فیل ہونے کے ساتھ ساتھ شادی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔

نکاح کے بعد جب ہم اندر بلائے گئے تو ہم مارے شرم کے پانی پانی ہو رہے تھے خاندان کی شادی تھی سب پہلے کے عزیز تھے جب ہماری خوش دامن نے ہمیں

پسینے سے تر بتر دیکھا تو لڑکیوں سے ڈانٹ کر کہا کہ کیوں گری پڑ رہی ہو۔ کیا کبھی دیکھا نہیں شرمیلا لڑکا ہے گیا پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ اس پر کسی شہری لڑکی نے شوخی سے کہا شرم ہے یا شرمندگی ہے۔

یہ سنتے ہی ہم پر غشی کا سا عالم طاری ہونے لگا اور اگر بر وقت شربت کا گلاس ہمارے سامنے پیش نہ کر دیا جاتا تو خطرہ تھا کہ شادی کا شور و غل کہرام میں تبدیل ہو جاتا۔

شکر بندی

یوپی ایک وزیر نے بلند شہر کے ایک جلسہ عام میں شکر کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب شادیاں شکر کے بغیر ہونی چاہیئے، شادی کی بات پکی کرنے سے پہلے لڑکی اور لڑکے والوں کو یہ طے کر لینا چاہیئے کہ شادی میں سب کچھ ہوگا لیکن شکر کا استعمال نہ ہوگا یعنی اب شادیاں شکر بند ہونا چاہیئے۔

لیکن ایک شکر خور کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ جب ہمارے وزیر صاحب اپنی تقریر میں شکر بندی کا پرچار کر رہے تھے تو ایک دیہاتی یہ کہتا ہوا جلسہ سے جاتا نظر آیا کہ شادی سے پہلے شکر بندی اور شادی کے بعد نس بندی پھر ایسی شادی سے فائدہ کا۔ ہم تو جنم بھر کنوارے رہب لا ایس شادی نہ کرب۔

شادی میں شکر بندی کی تجویز سے بچوں میں بھی بڑی کھلبلی مچ گئی ہے ان کا کہنا ہے کہ تیل، میں اور خدارات کی میٹھی رسمیں ختم ہو جانے کی وجہ سے گلگلے ٹھکریاں اور خدا رحم سے ہم لوگ یونہی محروم ہو چکے ہیں اب شادی بیاہ میں جو کچھ مٹھاس باقی ہے وہ صرف شکر اور چھوہاروں کے دم سے ہے اگر یہ بھی شکر بندی کی نذر ہو گئے تو پھر اس روکھی پھیکی، اور سوکھی سیٹھی شادی میں ہم لوگوں کے لئے رہی کیا جائے گا ہم ایسی بے مزہ شادی اپنے بھائی اور بہن کی کبھی نہ ہونے دیں گے۔

چلیے، صاحب! چھوٹی ہوئی ہمارا دیہاتی بھائی شکر بندی کی بنا پر جہنم بھر کنوارے رہنے کا فیصلہ کر رہا ہے اور شہری بچے اپنے ننھے بھائی اور منّو بہن کو زندگی بھر بن بیاہا رکھنے کو تیار ہیں لیکن بغیر شکر چھوہارے کے وہ بے مزہ بیاہ رچانے کے لیے وکسی طرح آمادہ نہیں۔ اب ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ننھے بھائی اور منّو بہن کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے لیکن نئے زمانے کے لوگوں میں سول میرج یعنی سادی شادی اور بے شکر کی جائے جس تیزی سے مقبول ہوتی جا رہی ہے اس کی بنا پر آپ ان کی رائے کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

آپ نے ایک کاج دو نتیجہ والی مثل تو سنی ہوگی لیکن جس مزے سے شکر بندی کی بنا پر اس مثل پر عمل ہو رہا ہے اس کی مثال ملنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

شادی بیاہ میں شکر بندی سے صرف شکر کے استعمال ہی میں کمی نہیں ہوگی بلکہ بچوں کی پیداوار میں بھی خاطر خواہ کمی کا امکان ہے کیونکہ نہ بانس ہوگا نہ بانسری بجے گی یعنی بے شکر کے نہ شادی ہوگی اور نہ آبادی بڑھے گی۔

شکر کی کمی سے جو پریشانی ہے اس سے کون واقف نہیں۔ لیکن شکر کی قلت کا ایک خوشگوار پہلو بھی ہے مگر اس کے بیان سے زبان قلم لڑکھڑا رہی ہے اگر آپ بیگم سے جاں بخشی کی ضمانت کے لیے تیار ہوں تو عرض کر سکتا ہوں۔

بے دھڑک فرمایئے! بیگم تو بیگم آج کل کے بڑے بڑوں کا غصہ ایک کیلو شکر میں اتارا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا اگر آپ ضمانت میں ایک کیلو شکر میرے پاس جمع کرنے کے لیے تیار ہیں تو میں بھی جان پر کھیل جانے کے لیے آمادہ ہوں۔

اچھا تو پھر شکر کی قلت کا اچھا پہلو سنیئے اور یاد رکھیئے! شاید وقت ضرورت کام آئے۔

جب تک شکر کی کوئی قلت نہ تھی تو وقت بے وقت، صبح، دوپہر، رات کسی وقت کوئی آتا تو اس کے لئے چار و ناچار بیگم کو چائے کا انتظام کرنا پڑتا کیوں کہ چائے کے متعلق وہ میرے بعض بے تکلف دوستوں سے بارہا یہ جملہ سن چکی تھیں کہ "ایوری ٹائم از ٹی ٹائم" یعنی جس طرح موت کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں اسی طرح چائے کا بھی کوئی وقت نہیں۔ چلچلاتی دھوپ اور کڑاکے کے جاڑے دونوں موسموں میں وہ یکساں مزہ دیتی ہے چنانچہ یہ سفید جھوٹ کہ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہونچاتی ہے، مثل کی طرح اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ اس کی تردید میں منھ کھولنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ شکر کی کمی نے ان بلا نوشوں سے نپٹنے کا ایک بہت اچھا بہانہ فراہم کر دیا ہے کل عین اس وقت جب کہ چائے سے فراغت کے بعد بیگم پان لگانے کے لیے پٹاری کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھیں کہ کسی صاحب نے دروازے پر ہانک لگائی "میں آسکتا ہوں"؟

میں نے فوراً آواز پہچان لی اور باہر جانے کے بجائے اندر ہی سے کہا کہ آپ وہ بلائے بے درماں ہیں کہ اگر منع بھی کیا جائے تو آپ سر پر نازل ہوئے بغیر کب ماننے والے ہیں اس لئے آپ خواہ مخواہ اجازت طلب کر کے ہم لوگوں کو کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ وہ اندر داخل ہو گئے اور بھابھی کو اس خلوص سے سلام کیا کہ جیسے وہ مجھ سے ملنے نہیں بلکہ بھابھی سے چائے کی فرمائش کرنے آئے ہوں۔ جب سے شکر کی قلت ہوئی بیگم کو ایسے پر خلوص سلاموں کا خاصہ تجربہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً تاڑ گئیں۔ کہ سلام کا کیا مطلب ہے۔ اور انھوں نے سلام کے جواب کے ساتھ ساتھ شکر کی قلت کا شکوہ اس درد

بھرے انداز میں شروع کر دیا کہ وہ چائے کی فرمائش بھول کر شکر کی فراہمی کی فکر میں مبتلا ہو گئے ۔ اور آخر کار وہ چائے پیئے بغیر بھابی سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے وہ ایک دن میں ایک آدھ کیلو شکر فراہم کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے ۔

ان کے جانے کے بعد میں نے بیگم سے مسکراتے ہوئے کہا کہ اگر شکر کی قلت اسی طرح کچھ دن اور جاری رہی تو تمہیں المیہ ڈراموں کی اداکاری کی اچھی خاصی مشق ہو جائے گی اور شکر کے ساتھ چائے کی بھی کافی بچت ہو جائے گی ۔

مگر وہ میرے اس جملے سے لطف اندوز ہونے کے بجائے بدمزہ ہو گئیں اور انھوں نے بگڑ کر کہا کہ آپ کو دنیا جہاں کی کچھ خبر تو رہتی نہیں آپ کو کیا معلوم کہ دو وقت چائے کے لئے شکر کی فراہمی میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور کس کس کی خوشامد کرنی پڑتی ہے راشن کی شکر تو ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ہی میں ہوا کی طرح اڑ جاتی ہے باقی پورا مہینہ کس طرح کٹتا ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے ۔

میں نے کہا اللہ تو خیر عالم الغیب ہی ہے اگر آپ اس سلسلہ میں صرف میری لاعلمی دور کرنا چاہتی ہوں تو خاکسار بلا عذر آپ کی بات سننے اور آپ کی کارگزاری کی دل کھول کر داد دینے کے لیے تیار ہے لیکن اس معاملہ میں اگر آپ مجھ سے کسی عملی قدم کی توقع رکھتی ہوں ۔ تو یہ محض آپ کی خوش فہمی ہو گی جس کا میں شکریہ ادا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا ۔

شکر کی فراہمی کے سلسلے میں بیگم کی کوششوں کا جو کچھ مجھے علم ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ کام میرے سپرد کیا جائے تو بس یہ صاف کہہ

دون کہ بھئی میں فرہاد بن کر جوئے شیر لانے کو تو تیار ہوں لیکن شکر کی جستجو میرے بس کی بات نہیں۔

جب سے شکر کی قلت ہوئی ہے بیگم نے یہ اپنا اصول بنا لیا ہے کہ خیر و خیریت کے بعد ہر آنے والے سے شکر کی کمی کا دھڑ کا ضرور روئیں گی۔ ایک آدھ بار ڈرتے ڈرتے میں نے انھیں ٹوکا بھی ارے بھئی ؟ آدمی دیکھ کے دکھڑا رویا کرو شکر فراہم کرنا ہر شخص کے بس کی تو بات نہیں لیکن بعض وقت ان کا یہ نسخہ ایسا کارگر ثابت ہوا کہ میں بھی حیرت میں رہ گیا۔

گاؤں سے کچھ کاشتکار اپنے کام سے میرے پاس آئے وہ اپنے کام کے متعلق مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ بیگم کو سن گن مل گئی اور وہ بے چین ہو گئیں شامت اعمال جب وہ جانے لگے تو انھوں نے کہا کہ بی بی جی سے پوچھ لیجیے کہ اچار کے لئے سرکے کی تو ضرورت نہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ بیگم پردے کے پیچھے سے بے اختیار بول اٹھیں ارے بھیّا ! سرکے کی ضرورت تو ہے ہی مگر خالی سرکہ لے کے کیا کریں۔ خواہ مخواہ اتنی دور سے تمہیں سرکہ لانے کی زحمت بھی دیں اور وہ کسی کام بھی نہ آئے۔ نہیں معلوم کب سے میٹھی چٹنی بنانے کا ارادہ تھا لیکن شکر بغیر کچھ بھی تو نہیں ہو سکتا عجیب مصیبت ہے بعض دن تو بغیر چائے کے بسر کرنی پڑتی ہے۔

بیگم نے یہ الفاظ بڑے رقت آمیز لہجے میں کہے جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ان لوگوں نے کہا کہ صاحب ہم لوگ تو جانئے دانے بیت نا ہی۔ تیج تہوار کی کھاتر اناج کے بدلے ما سرکار سے دس پانچ کیلو شکر لے لیت ہے۔ اب کی آدائی تین کیلو آپ کے لیے لیت آؤب۔

یہ سن کر بیگم کو جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا تو مجھے کوئی اندازہ نہیں لیکن میری

حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں بھی اس کا قائل ہو گیا کہ اگر اللہ دینا چاہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اس لیے بلا امتیاز مانگتے رہنا چاہیئے معلوم نہیں کس کے ذریعہ اللہ شکر فراہم کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔

شام کو ہم لوگ بچی کھچی شکر سے پھیکی سیٹھی چائے پی کر بیٹھے تھے بیگم فکر فردا یعنی صبح کی چائے کے لیے شکر کی فکر میں مبتلا تھیں اور میں فکر امروز یعنی آج کا اخبار پڑھنے میں مشغول تھا کہ لکڑی والے نے ڈیوڑھی میں آ کر بیگم کو یہ نیک مشورہ دیا کہ برسات آ گئی ہے اس وقت سوکھی لکڑیاں موجود ہیں دس بارہ من فاضل بھجوا دیں بدلی بوندی میں کام آئیں گی ورنہ جہاں جھڑی لگی سوکھی لکڑیاں دیکھنے کو نہ ملیں گی

بیگم نے فوراً اس پر جملہ چپکایا ایک لکڑی ہی پر کیا منحصر ہے آج کل ہر چیز عنقا ہو رہی ہے شکر ہی کو لو پہلے منوں شکر یوں پڑی رہتی تھی بعض لوگ تو راشن سے پوری شکر لیتے بھی نہ تھے اور اب یہ حال ہے کہ چائے کے لیے چمچہ بھر شکر ملنا مشکل ہے۔ اس وقت تو جھاڑ پونچھ کر کسی طرح چائے بن گئی صبح چائے نصیب ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے محلے پڑوس میں بھی تو کسی کے یہاں نہیں جو مانگ جانچ کے کام چلا لیا جائے اور موئی چائے کی ایسی بری لت لگ گئی ہے کہ صبح چائے نہ ملنے کے خیال ہی سے جمائیاں آ رہی ہیں معلوم نہیں کل کیا حال ہو۔

میں نے کہا بیگم! مگر بیچارہ لکڑی والا کیا کرے گا اگر گنّے کے بجائے لکڑی سے شکر بن سکتی تو شاید وہ آپ کی کوئی مدد کر سکتا۔

اس پر وہ نیک دل لکڑی والا بولا اگر شکر کی آپ کو اتنی دقت ہے کہ چائے نہیں بن سکتی تو میں نے بڑی دوڑ دھوپ اور بڑی سفارش سے گیارھویں کے لیے جو شکر جمع کی ہے اس میں سے ایک آدھ کیلو بھجوائے دیتا ہوں تا کہ صبح کی چائے

کا انتظام ہو جائے بیگم صاحبہ میں پیسے نہیں لوں گا گیارھویں کے موقعہ پر شکر ہی لوں گا۔

یہ سنتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکل پڑا کہ اللہ شکر خورے کو کہیں نہ کہیں سے شکر فراہم ہی کر دیتا ہے کون تصور کر سکتا تھا کہ لکڑی والا لکڑی کے بجائے شکر کا بندوبست کر دے گا۔

اس کے بعد بیگم نے اپنی اس فتح مندی پر میری طرف بڑے فخریہ انداز میں اس طرح دیکھا جیسے کہ کہہ رہی ہوں اللہ اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے۔

ٹیلی فون

ٹیلی فون رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ رحمت اسلئے کہ بقول شاعر ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

دل کے آئینے میں تصویر یار دیکھنے کے لئے تو شیروانی اتارنے اور قمیص کے بٹن کھولنے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے اور پھر بھی تصویر یار کی زیارت کے علاوہ ہم کلامی کا شرف نہیں حاصل ہو پاتا لیکن ٹیلی فون کی ایجاد سے جہاں دھن والوں کو اپنے کاروبار میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں وہاں دل والوں کو بھی کاروبار عشق میں کافی سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں۔

اب اس کی ضرورت نہیں رہی کہ پیام محبت بھیجنے کے لیے پتنگ یا کبوتر کی خدمات حاصل کی جائیں اور اس پیچیدہ مسئلے پر غور کرنے میں وقت ضائع کیا جائے ؎

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پر
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

ادھر آپ کی یہ دشواری معلوم کرکے نامہ و پیام کا کوئی ماہر بڑی سنجیدگی سے یہ مشورہ دے کہ ؎

خط کبوتر اس طرح لے جائے بام یار پر
پر ہی پر نامہ لکھا ہو پر کٹیں دیوار پر

اور پھر اس کے بعد آپ ایک ایسا کاتب تلاش کریں کہ جو کاغذ پر لکھنے کے بجائے کبوتر کے پروں پر آپ کی داستان محبت اس طرح تحریر کر سکے کہ پر کٹنے کے باوجود مضمون نہ کٹنے پائے۔

خدا کا شکر ہے کہ ٹیلی فون کی ایجاد نے آپ کو ان تمام زحمتوں سے ایک ساتھ نجات دلا دی اور اب کسی کی یاد کی ھوک دل میں اٹھتے ہی آپ تصویر یار دیکھنے کے لیے گردن جھکانے کے بجائے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیتے ہیں اور آن کی آن میں آپ اس سے ہم کلام ہو جاتے ہیں جس کی محفل کا شکوہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا ؂

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ٹیلی فون کی ایجاد کے ساتھ ساتھ اس کی محفل کا رنگ بھی کافی بدل چکا ہے اور اب آپ کو ٹیلی فون پر ہم کلامی کی بنا پر کسی کی زبان درازی کی تو شکایت ہو سکتی ہے لیکن اپنی زبان بندی کا گلا غالباً نہ کرنا پڑے۔

بعض ایسے دل پھینک پائے جاتے ہیں جو شاید دلدار کی دید کی تاب نہ لا سکنے کے ڈر سے رو در رو بات کرنے کے بجائے ٹیلی فون ہی پر اظہار عشق کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس طریقہ کار کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں غالب صاحب کی طرح پاسبان کے پاؤں پکڑنے اور پھر اس کے نتائج بھگتنے کی نوبت کبھی نہیں آتی بہت کچھ ہوا تو چند ایسی گالیاں کھانے کو مل جاتی ہیں جن کے متعلق غالب صاحب نے کہا تھا ؂

کتنے شیریں ہیں ترے لب کے رقیب
گالیاں کھا کے بد مزہ نہ ہوا

لوگوں کا خیال ہے کہ ٹیلی فون پر نا دیدہ اظہار عشق کیا ہی اس لئے جاتا ہے کہ حسن پر ہم کا جلوہ دیکھنے میں تو خطرات ہیں لیکن ٹیلی فون پر اس کی برہمی سننے میں کوئی خاص اندیشہ نہیں ۔ اور لطف خاصا آتا ہے ۔

لیکن ٹیلی فون پر اظہار عشق میں بعض وقت بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس طرح تاک جھانک میں نظر کی پہچان ضروری ہے اسی طرح ٹیلی فون پر اظہار محبت میں آواز کی پہچان بڑی اہمیت رکھتی ہے ذرا سی گڑ بڑ میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے ۔

ایک صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی ایک رات بیگم میکے میں بستر پر آرام کر رہی تھیں اور خود دفتر میں قلم گھس رہے تھے جب ذرا رات بڑھی کچھ سناٹا ہوا اور رخسار پر کسی کی زلفیں پریشان ہونے کے بجائے خیالات پریشان ہونے لگے تو انھوں نے دل بہلانے کے لئے ٹیلی فون اٹھایا ۔

دوسری طرف سے ایک سریلی آواز سنائی دی جو پوچھ رہی تھی آپ کسے چاہتے ہیں ؟ یہ حضرت اس آواز کو بیگم کی نہیں بلکہ اپنی سالی کی آواز سمجھے اور مذاق کے موڈ میں آ کر فرمانے لگے بتائیے آپ کون ہیں ؟ ممکن ہے میں آپ ہی کو چاہنے لگوں ۔

اُدھر سے دھیمی آواز میں جواب ملا ۔ میرا نام گلشن رخسار ہے مجھے چاہ کے کیا کیجئے گا ۔ بڑی بٹیا کو بلائے دیتی ہوں ۔

ٹیلی فون جہاں نادیدہ عاشقوں کی طرف سے حسن والوں کو پیام محبت پہنچانے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیتا ہے وہاں وہ نامعلوم ڈاکوؤں کی جانب سے دھن والوں کو دھمکیاں دینے کا کام بھی بڑی رازداری سے پورا کرتا ہے اس کے علاوہ بعض سعادت مند طالب علم امتحان میں نمبر بڑھوانے کے لیے اپنے استادوں کو قتل کی دھمکی دینے کا نیک کام بھی اسی ٹیلی فون ہی سے لیتے ہیں کیونکہ یہ اتنا بڑا راز دار ہے کہ اس کے سینے میں ایسے ایسے راز دفن ہیں کہ اگر وہ ظاہر کر دے تو بڑے بڑے فتنا ڈال

کی پیشانی پسینے سے تر ہو جائے اور مہمانی پیش کرنا مشکل ہو جائے۔

بکریوں کے متعلق مشہور ہے کہ غم نہ داری بز بخر، یعنی اگر کوئی غم نہ ہو تو بکری خرید لیجیے، لیکن چونکہ اب بکری پالنا نیک کام کے بجائے برا خیال کیا جاتا ہے اس لیے شاید لوگ اب بکری پالنے کے بجائے ٹیلی فون لگوا لیتے ہیں تاکہ کسی وقت چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہو۔

اس سلسلہ میں ہمارا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر ہمارے دفتر سے ٹیلی فون ہٹا لیا جائے تو ہماری کارکردگی اگر دوگنی نہیں تو ڈیوڑھی ضرور ہو جائے۔ اس لئے کہ عین اس وقت پر جب ذہن یکسو اور قلم زوروں پر ہوتا ہے تو یہ مرغ بے ہنگام کی طرح چیخ کر خیالات کا تانا بانا بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے اور ٹیلی فون اٹھانے پر ساری ''رانگ نمبر'' کا مژدہ سن کر موڈ اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ ٹیلی فون سے اپنا سر پھوڑ لیں لیکن یہ ظالم سر پھوڑنے کا بھی موقع نہیں دیتا ہے اور پھر سے چیخنے لگتا ہے اور اب ٹیلی فون اٹھانے پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب کے ننھے میاں ٹیلی فون کر نہیں رہے ہیں بلکہ ٹیلی فون کرنے کی مشق کر رہے ہیں اور اتفاق سے تختۂ مشق ہمارا ہی نمبر بنا ہوا ہے اور جب ٹیلی فون اٹھایئے تو ادھر سے ننھے میاں سوائے ہلو ہلو کے اور کچھ نہیں کہتے۔ جب ہم لوگ بہت عاجز آ گئے تو ہمارے ایک ساتھی کو بڑی اچھی ترکیب سوجھی اور جونہی مرتبہ جب پھر گھنٹی بجی اور صاحبزادے نے ہلو ہلو کرنا شروع کر دیا تو انھوں نے کہا کہ بیٹا دیکھو تمہاری امی باتھ روم سے نکل رہی ہیں بھاگو نہیں تو بڑی پٹائی ہو گی اس طرح تقریباً آدھ گھنٹہ ضائع کرنے کے بعد ننھے میاں کی ٹیلی فون بازی سے ہم لوگوں کو نجات ملی۔

ہمیں تو صاحب ان لوگوں کو دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے جو پہلو میں معشوق کی طرح ٹیلی فون رکھے ہوئے مزے میں لکھتے پڑھتے بھی رہتے ہیں اور ٹیلی فون پر بات چیت

بھی کرتے رہتے ہیں اپنا تو یہ حال ہے کہ اگر ٹیلی فون پاس رکھا ہو تو چاہے اس کی گھنٹی بجے یا نہ بجے اپنے دماغ میں مسلسل گھنٹی بجتی رہتی ہے اور یقین کیجئے کہ ایک جملہ لکھنا بھی محال ہو جاتا ہے۔

ہمارے جاننے والوں میں ایک صاحب ایسے ٹیلی فون باز ہیں کہ انھیں ٹیلی فون سے چند منٹ کی جدائی بھی شاق گزرتی ہے اور ٹیلی فون سے انھیں۔ اتنا لگاؤ ہو گیا ہے کہ شاید بجنے سے پہلے ہی انھیں خبر ہو جاتی ہے اور وہ سب سے پہلے اسے اٹھا لیتے ہیں ٹیلی فون کے نمبروں کے سلسلہ میں ان کے حافظے کا یہ حال ہے کہ ہم سب لوگ انھیں چلتی پھرتی ڈائرکٹری سمجھنے لگے ہیں اور کوئی نمبر بھی ملانا ہو تو پہلے ان ہی سے دریافت کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ مجھے سنٹرل جیل کا نمبر ملانا تھا میں نے حسب عادت ان ہی سے رجوع کیا اس پر انھوں نے چڑھ کر کہا کہ جیل کا تو نمبر نہیں معلوم ہاں اگر جہنم سے رابطہ قائم کرنے کا ارادہ ہو تو اسکا نمبر بتا سکتا ہوں اس پر میں نے کہا کہ اگر جہنم میں ٹیلی فون ہوا تو میں اللہ میاں سے درخواست کرونگا کہ وہ میری سیٹ آپکی سیٹ سے بدل دیں کیونکہ ٹیلیفون والی جہنم آپ کیلئے جنت کی طرح کم ہوگی اور جنت میں آپ جانتے ہیں حور و غلمان اور شراب انگبیں سب چیزوں کی موجودگی کا مژدہ سنایا گیا ہے لیکن کہیں ٹیلی فون کا ذکر نہیں آیا اب آپ ہی بتایئے کہ ایسی جنت کو لے کر آپ کیا کریں گے کہ جس میں ٹیلی فون نہ ہوں۔

اس پر ایک صاحب بولے کہ بھئی میرا ارادہ ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی اور انھوں نے ٹیلی فون کر کے اپنے مرنے سے پہلے ملک الموت کو میرے لئے طلب نہ کر لیا تو میں دفناتے وقت ان کے سینے پر ایک ٹیلی فون سٹ بھی رکھوا دوں گا ورنہ اس کی جدائی میں بچارے کی میت قبر میں بھی اچھی طرح نہ لگ سکے گی۔

میں نے کہا بھئی خدا کے لئے ایسا غضب نہ کرنا ورنہ ان کی میت قبر میں لگے یا

نہ نکلے یہ ہم لوگوں کا دفتر میں بیٹھنا دو بھر کر دیں گے اور اتنے فون کریں گے کہ ہم لوگ زندگی سے عاجز آ کر زندہ درگور ہونے کے لئے دفتر چھوڑ کر عیش باغ (قبرستان) کی طرف بھاگیں گے۔

قبر میں ٹیلی فون فراہم کرنے کی اس نیک تجویز پر وہ مسکرا کر بولے کہ اگر یہ ادارہ ہے تو جین خاص میں میرے مقبرے کے لئے جگہ محفوظ کرا لو ورنہ عام قبر کے لئے ٹیلی فون کنکشن ملنا محال ہو جائے گا۔

داد کی بیداد

از عبدالمجیب سہالوی ـــــــ کے متعلق

مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے

اہم ۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضمونوں، خاکوں کا مجموعہ، ابتذال عریانی، پھکڑ سے پاک شوخی، شستگی، برجستگی کا نمونہ ۔ شریف گھرانوں میں، شائستہ محفلوں میں بار پانے کے قابل یہ قلمی "بےداد" قابلِ داد ہے ۔

داد کی بیداد

از عبدالمجیب سہالوی ـــــــ کے متعلق

پروفیسر احتشام حسین کی رائے

وہ لوگ قابلِ مبارکباد ہیں جنھیں یہ دولت عطا ہوئی ہے کہ وہ کالے بادلوں میں روشن لکیر دکھا سکیں ۔ انھیں میں ہمارے دوست قومی آواز کے عملہ ادارت کے جانے پہچانے صحافی سہالوی (عبدالمجیب سہالوی) بھی ہیں انکی سادگی میں رنگینی ۔ خاموشی میں گہرائی، بےنیازی میں خلوص اور نیکی میں دردمندی ہے ۔ ان کی خاموش نگاہوں میں انسانی محبت اور بظاہر بےتعلقی میں شگفتگی جھلک دیکھی جا سکتی ہے یہی انکے مزاحیہ اور فکاہی مضامین کی بنیادی خصوصیات ہیں ۔

اُن کے مزاح میں خوش دلی اور انداز بیان میں دلکشی ہے ۔ وہ طنز کے نشتر چبھوتے ضرور ہیں لیکن انھیں نہ تو زہر میں بجھاتے ہیں اور نہ زخم کے اندر توڑ دیتے ہیں بلکہ ہلکے ہلکے کچوکے لگا کر بیدار اور متوجہ کر دیتے ہیں ۔

عبدالمجیب سہالوی کے پہلے مجموعہ ' داد کی بیداد ' کے مضامین پر مزاحیہ اور ظریفانہ رنگ غالب ہے کہیں کہیں طنز سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن شگفتگی اور خوش ذوقی کے ساتھ۔ زندگی، زمانہ اور سیاست کے بے ڈھنگے پن ناہمواری اور عدم توازن کو اس طرح دیکھا اور دکھایا گیا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔

ایک اچھے مزاح نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے مضحک پہلوؤں کی مصوری یا نشان دہی کرتے وقت خود مضحکہ خیز نہ ہو جائے۔ سہالوی صاحب اس راز سے بڑی حد تک واقف ہیں۔

(ہماری زبان)

داد کی بیداد، سہالوی صاحب کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے مگر وہ لکھنے والے بہت پرانے ہیں۔ مجیب صاحب بجد سادہ زبان لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح کے لیے وہ نہ الفاظ سے کھیلتے ہیں اور نہ ان کا گورکھ دھندا بناتے ہیں۔ وہ محض ذہانت اور ذکاوت سے نہیں ہنساتے بلکہ اس بے ہنگم صورت حال کو اجاگر کر دیتے ہیں جو مسائل میں مضمر ہے ہنسی ہم آپ کو اس پر آتی ہے کہ ہم بھی کیسے کیسے مضحکہ خیز معاملوں کا نشانہ بنے ہیں۔

مجیب صاحب کا موضوع متوسط اور نچلے متوسط طبقے کا آدمی اور اسکے روز مرہ کے مسائل ہیں انھوں نے بڑی شور زمین میں گلاب اگانے کی کوشش کی ہے۔ یہ اُن ہی کی ہمت ہے کہ وہ روزمرہ جو کچھ عام انسان پر گزرتی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسی کو اپنا موضوع بناتے ہیں

(نیا دور، لکھنؤ)